زبان وادب، تہذیب وثقافت کا ترجمان

نیا دور

جولائی ۲۰۱۷ء
۱۰؍روپئے

اورھن پامک　　خوشبیر سنگھ شاد　　ڈاکٹر سلمیٰ شاہین
الماس شبی　　حمیرا عالیہ　　سدرشن وشِشٹھ
زیب اختر　　نعمان شوق　　نصرت مھدی

محکمۂ اطلاعات ورابطۂ عامہ، اترپردیش

جلد : ۷۲ شمارہ : ۴

ماہنامہ **نیا دور** لکھنؤ

جولائی ۲۰۱۷ء

پبلشر: انج کمار جھا

ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات ورابطۂ عامہ، اتر پردیش

ایڈوائزر

ڈاکٹر وضاحت حسین رضوی

ایڈیٹر

سہیل وحید

فون: 9415007694

Ph. No. 2239132 Ext. 115

Email:

nayadaurmonthly@gmail.com

تزئین کار : وقار حسین

کور پینٹنگ: ایس.آر. جائسوال

مطبوعہ: پرکاش پیکیجرس، گولہ گنج لکھنؤ

شائع کردہ: محکمۂ اطلاعات ورابطۂ عامہ، اتر پردیش

زرِسالانہ : ایک سو دس روپئے

فی شمارہ : دس روپئے

ترسیل زر کا پتہ

ڈائرکٹر

انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ

پارک روڈ، اتر پردیش، لکھنؤ 226001

Please send M.O./Bank Draft in favour of Directer, Information & Public Relations Department, UP, Lucknow

خط و کتابت کا پتہ

ایڈیٹر نیا دور، پوسٹ باکس نمبر ۱۴۶ لکھنؤ ۲۲۶۰۰۱

بذریعۂ رجسٹری:

ایڈیٹر نیا دور، انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ

پارک روڈ، سوچنا بھون، اتر پردیش، لکھنؤ 226001

عنوانات

اداریہ

اپنی بات ..... ایڈیٹر ۲

مضامین

خاکہ، قمر رئیس؛ ایک زندگی کے حوالے سے ..... ڈاکٹر سلمیٰ شاہین ۵

قمر رئیس؛ فن کے آئینے میں ..... نفیس عبدالحکیم ۹

افسانے

ان کی واپسی ..... زیب اختر ۱۷

کل جمع ٹوٹل میزان ..... طارق شاہین ۲۵

آگ کے جگنو ..... حمیراء عالیہ ۳۱

گزشتہ لکھنؤ

فن رقص و موسیقی اور مصوری و خطاطی ..... مرزا جعفر حسین ۳۵

ہندی کہانی

کترنیں ..... سدرشن وششٹھ ۴۱

ہندوستانی زبانیں

ایندھن (تیسری قسط) ..... حمید دلوائی ۴۵

غیر ملکی ادب

انجانی محبت ..... اورہن پامک ۴۹

غزلیں و نظمیں

غزلیں ..... خوشبیر سنگھ شادؔ ۳

غزلیں ..... ڈاکٹر نصرتؔ مہدی، زہراؔ قرار ۴

غزلیں ..... نعمان شوقؔ، خوشترؔ رحمانی ۱۶

غزلیں ..... الماس شبی ۲۴

غزلیں ..... گمانؔ انصاری، رفعت عزمیؔ ۴۴

نقد و تبصرہ

احساس ..... صغیر نوری ..... تقی شبر نما ۵۴

رام منچندا بانی ..... عمیر منظر ..... شاہد کمال ۵۵

خطوط

آپ کے خطوط ۵۶

نیا دور میں شائع ہونے والے تمام تر مشمولات میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے، اس کی پوری ذمہ داری مصنف کی ہے۔ حکومت اتر پردیش کا اس سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

اپنی بات

مئی کے شمارے سے 'نیا دور' کے رنگ و آہنگ میں جو تبدیلی کی گئی، اسے عام طور پر پسند کیا جا رہا ہے۔ شائقین 'نیا دور' کی جانب سے اس تبدیلی پر خوشی کا اظہار کیا جا رہا ہے۔ ہماری کوشش ہے کہ 'نیا دور' کو جدید دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرتے ہوئے اس کی مسلسل اشاعت کو یقینی بنایا جائے۔ مئی اور جون کے شمارے وقت پر شائع ہوئے اور

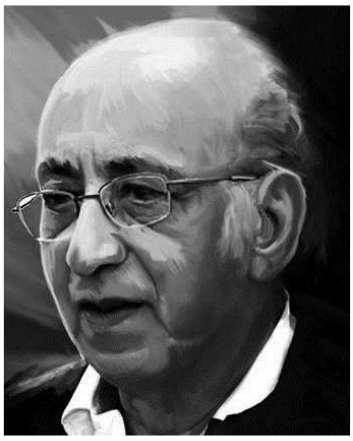

جدید دور کے مشہور شاعر اور معروف نغمہ نگار ندا فاضلی کی شریک حیات محترمہ مالتی جوشی نے 'نیا دور' کے بیحد اصرار پر ندا صاحب کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر لکھنے کی حامی بھر لی ہے۔ جلد ہی 'نیا دور' کے آئندہ کسی شمارے میں محترمہ مالتی جوشی کی تحریر ملاحظہ فرمائیں۔

جولائی کا یہ شمارہ وقت پر شائع ہو رہا ہے۔

آزادئ نسواں کی علمبردار مشہور و معروف افسانہ نگار عصمت چغتائی کے ۱۰۲ ویں یوم ولادت کے موقع پر 'نیا دور' کے اگست کے شمارے میں ان پر ایک گوشہ شائع کیا جائے گا جس میں بطور خاص ان کی لکھنؤ قیام کی نادر تصاویر شائع کی جائیں گی۔

ترقی پسند تحریک کے اہم ستون اور مشہور نقاد پروفیسر قمر رئیس کی ۸۵ ویں یوم ولادت کے موقع پر بطور خراج عقیدت ہم ان پر کچھ خاص تحریر شائع کرنے کی جگت میں تھے۔ ان کی شاگردہ ڈاکٹر سلمیٰ شاہین سے جب اس معاملہ میں گفتگو ہوئی تو انہوں نے استادِ محترم کے بارے میں اپنی تصنیف 'قمر رئیس؛ ایک زندگی' کا ذکر کیا۔ ہم نہیں چاہتے تھے کہ استاد کے بارے میں ایک دم روایتی قسم کا ایک اور مضمون شمارے میں شائع کر دیا جائے لہٰذا ڈاکٹر سلمیٰ شاہین سے ہم نے دوبارہ رجوع کیا، ان سے ہوئی تفصیلی گفتگو کے ماخذ کے طور پر استادِ محترم کے بارے میں اردو کے اہم ادباء و شعراء کی آراء کو بذریعہ ڈاکٹر سلمیٰ شاہین ایک سلسلے وار کڑی کے طور پر حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے کہ اپنے شفیق استاد کے تئیں کچھ تو فرض ہمارا بھی بنتا ہے۔ ان کی یاد ہمیشہ ایک تحریک کے طور پر جب تب آتی رہتی ہے۔ اپنی لکھنؤ آمد کے دوران ایک مرتبہ انہوں نے ہم سے پوچھا تھا کہ تم نے افسانے لکھنا کیوں بند کر دئے، ہم کچھ نہیں بولے تو پھر انہوں نے کہا تھا 'اپنے اندر لکھنے کی تحریک نہ مرنے دینا'۔

اپریل ۲۰۱۷ء کے آخر میں جب 'نیا دور' کی ادارت کی ذمہ داری ہمیں دی گئی تو ہم نے مئی ۲۰۱۷ء کے شمارے سے ہی لکھنؤ کے ادب اور تہذیب کو ذہن میں رکھ کر 'نیا دور' کے آئندہ شماروں کا خاکہ تیار کیا تھا۔ اسی ضمن میں 'لکھنؤ کی آخری بہار' سے مرزا جعفر حسین کی تحریروں کا سلسلہ جاری ہے۔ اس کے علاوہ لکھنؤ کی تہذیب و ثقافت پر مختلف شعبوں کے قلمکاروں سے تصنیفات حاصل کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

گزشتہ لکھنؤ ہم سب کے دل و دماغ کو اس قدر معطر رکھتا ہے کہ ہم اس سحر سے آزاد ہونے کی کوشش بھی نہیں کر پاتے ہیں کیونکہ ہمیں اس سے گریز بھی نہیں بلکہ فخر ہے۔

لکھنؤ کے آخری تاجدار نواب واجد علی شاہ کی ہمہ جہت شخصیت سے بھلا کون واقف نہیں۔ ان کی فنی اور شعری صلاحیتوں پر آج بھی لوگ سر دھن رہے ہیں۔ ان کی ۱۹۵ ویں یوم ولادت کے موقع پر ان کی تخلیق کی ہوئی تین ٹھمریاں اور لکھنؤ کی یاد میں ان کی ایک غزل پیش کرتے ہوئے ہمیں بیحد مسرت کا احساس ہو رہا ہے۔

لکھنؤ سے گہرا تعلق رکھنے والے مشہور شاعر جناب خوشبیر سنگھ شادؔ کے ہم ممنون ہیں کہ انہوں نے ہماری استدعا کو قبول کرتے ہوئے ہمیں اپنی غزلیں 'نیا دور' میں شائع کرنے کے لئے فراہم کریں نیز امریکہ کے پنچ ریڈیو کی سی ای او محترمہ الماس شبی اور دیگر تخلیق کاروں کے بھی بیحد شکر گزار ہیں۔

جون کے شمارے میں شائع ہونے والی تمام تخلیقی نگارشات کے تخلیق کاروں کے قلمی تعاون کے لئے ہم شکر گزار ہیں کہ انہوں نے ماہنامہ 'نیا دور' کے اس جدید رنگ و آہنگ کو ایک سمت و رفتار عطا کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ ہم امید کرتے ہیں کہ ہمارے معاصر تخلیق کار اس ادبی مسافت میں ہماری

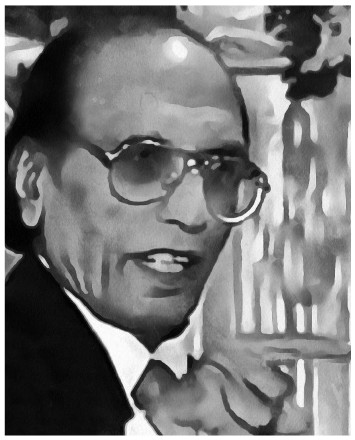

مقبولیت کی بلندیوں کو سر کرنے والے عہد جدید کے مشہور شاعر بشیر بدر گزشتہ کافی عرصہ سے بستر علالت پر ہیں۔ ہمیں یہ بتاتے ہوئے خوشی ہو رہی ہے کہ جلد ہی ہم ان پر بھی ایک گوشہ شائع کریں گے۔ بشیر بدر کی علالت اور ان کی ذہنی کیفیت کے بارے میں ان کی اہلیہ سے گفتگو بھی اس میں شامل ہوگی۔

معاونت کرتے رہیں گے۔

ہم جلد ہی 'نیا دور' کو عالمی سطح پر ایک نئی شناخت قائم کرنے اور اس کے ای ایڈیشن کو بھی شروع کرنے کی کوشش کریں گے تاکہ دوسرے ممالک میں موجود زبان و ادب سے دلچسپی رکھنے والوں تک ہم رسائی حاصل کر سکیں۔ فی الحال www.information.up.nic.in پر 'نیا دور' کے شمارے دستیاب ہیں۔

سہیل وحید

غزلیں

خوشبیر سنگھ شادؔ
بی۹، سلور ریزیڈنسی اپارٹمنٹ، نکودر روڈ، جالندھر
موبائل: 9872011882

دیکھنے والوں سے میرا حال کب سمجھا گیا
بے نیازی کو مری حسن طلب سمجھا گیا

ہم سے بھی اک سائے کو پیکر نہیں مانا گیا
اس جسارت پر ہمیں بھی بے ادب سمجھا گیا

آپ کی یہ تہمتیں سب سر بہ خم تسلیم ہیں
اک گزارش ہے مگر ہم کو بھی کب سمجھا گیا

آسماں پر چاند اور تاروں کے بھی ہوتے ہوئے
ایک جگنو تھا جسے توقیر شب سمجھا گیا

آخرش کرنا پڑا جب تجزیہ کردار کا
کم نسب نکلے جنہیں عالی نسب سمجھا گیا

ہم تو سمجھے تھے بہت آسان ہوگی زندگی
کتنی مشکل سے مگر جینے کا ڈھب سمجھا گیا

شادؔ کہلانے کی آخر یہ سزا ہم کو ملی
دل گرفتہ تھے مگر اہل طرب سمجھا گیا

وہ جو معمول تھا اس سے طبیعت کچھ الگ سی ہے
ادھر کچھ دن سے مرے دل کی حالت کچھ الگ سی ہے

کھڑا ہوں میں بھی اس صف میں ضرورت مند ہوں میں بھی
مگر اے زندگی میری ضرورت کچھ الگ سی ہے

کوئی ابہام بھی پوشیدہ ہے اظہار میں ان کے
جو واضح تو ہوا لیکن وضاحت کچھ الگ سی ہے

مجھے حیرت زدہ نظروں سے اکثر دیکھتا تھا یہ
مگر اس بار آئینے کی حیرت کچھ الگ سی ہے

مسلط ذہن و دل پر ہے جو اک بے چہرہ خاموشی
جنوں ہے اور نہ سودا ہے، یہ وحشت کچھ الگ سی ہے

مری مایوس آنکھوں میں بجھے ہیں خواب پہلے بھی
مگر اس بار ان آنکھوں کی رنگت کچھ الگ سی ہے

میں خود کو شادؔ اپنی ذات میں مصروف رکھتا ہوں
میں فرصت میں تو ہوں لیکن یہ فرصت کچھ الگ سی ہے

غزل

کیوں خزاں میں ہری بھری ہوئی ہے
شاخِ گل تو تو باوری ہوئی ہے

کیا اڑانوں کو حوصلہ دے گی
اے ہوا تو تو خود ڈری ہوئی ہے

زندگی مل کبھی تو فرصت سے
بات ابھی تجھ سے سرسری ہوئی ہے

کوئی منظر نہیں ہے آنکھوں میں
رتجگوں کی تھکن بھری ہوئی ہے

قربتیں کروٹیں بدلتی ہوئی
اور انا بیچ میں دھری ہوئی ہے

یہ جو بیٹھے ہیں سر جھکائے ہوئے
آج ان سے کھری کھری ہوئی ہے

خود کلامی ہے یہ تیری نصرتؔ
مت ابھی سوچ شاعری ہوئی ہے

ڈاکٹر نصرت مہدی
ایف ۹/۴، چارامل، بھوپال
موبائل: 9425012227

غزل

حقیقتوں کو فسانہ نہیں بناتی میں
تمہارے خواب کو خود سے نہیں جگاتی میں

وہ فاختہ کی علامت اگر سمجھ جاتا
تو اس کے سامنے تلوار کیوں اٹھاتی میں

جناب واقعی میں نے کہا نہیں جانا
وگرنہ آپ کی گاڑی میں بیٹھ جاتی میں

پھر ایک دم مرے پیروں میں گر گئے کچھ لوگ
قریب تھا کہ کوئی فیصلہ سناتی میں

خدا کا شکر کہ وہ راستے سے لوٹ گیا
اگر وہ آتا تو اس کو کہاں بٹھاتی میں

کسی خیال میں ہاتھوں سے چھوٹ جاتے ہیں
یہ جان بوجھ کے برتن نہیں گراتی میں

وہ دل ہو یا مری گڑیا کی موت ہو جو ہو
ہمیشہ سوگ میں چولہا نہیں جلاتی میں

میں مانتی ہوں مرا فیصلہ غلط نکلا
تمہیں بتاؤ کہ پہلے کسے بچاتی میں

مرا بدن کسی تتلی سے کم نہیں زہراؔ
تو مر نہ جاتی اگر تیرے ہاتھ آتی میں

زہرا قرار
شیواجی نگر، ممبئی
موبائل: 9494165510

قمر رئیس
ایک زندگی کے حوالے سے

ڈاکٹر سلمیٰ شاہین
نیو ہاریزن اپارٹمنٹ، تغلق آباد ایکسٹینشن، نئی دہلی
موبائل: 9971824933

'قمر رئیس؛ ایک زندگی' کی ترتیب وتحریر کے مراحل میں مختلف اصناف کے ماہرین کی قمر صاحب کے بارے میں رائے اور تاثرات کو ہم نے چار حصوں میں 'نیا دور' کے لئے خصوصی طور پر تقسیم کیا ہے۔

عکس ذات

گاندھی فیض عام کالج (جو شاہجہانپور کا پہلا ڈگری کالج ہے) میں مصاحب علی خاں اور میرا ساتھ رہا۔ اس عرصہ میں درجنوں لڑکوں کی موجودگی میں اگر میں کسی کو اپنا دوست بنا سکا تو وہ مصاحب علی تھے۔ اس کی وجہ مصاحب علی کی پرکشش شخصیت تھی۔ عام لڑکوں کے مقابلے میں یہ لڑکا مجھے ہمیشہ مختلف اور منفرد نظر آیا۔ متین، سنجیدہ، شائستہ، ذہین اور پرخلوص لیکن ان خوبیوں سے بڑھ کر مصاحب علی کی جس ادا نے مجھے اپنا دلدادہ بنا لیا تھا وہ اس کا کھویا کھویا سا انداز تھا جیسے وہ کسی کوہ بےستون کی تلاش میں سرگرداں ہو۔

اپنی جنم بھومی کسے عزیز نہیں ہوتی۔ مولانا الطاف حسین حالی لاہور جیسے گل وگلزار شہر میں رہ کر بھی پانی پت کے 'حب وطن' سے خود کو آزاد نہ کر سکے تھے تو پھر ہم کیسے اپنے شاہجہانپور کو فراموش کر سکتے ہیں۔ اس طرح قمر رئیس بچپن کے لنگوٹیا یاروں کے لئے چھکن، اسکول اور کالج کے ساتھیوں کے لئے مصاحب علی اور ادبی دنیا کے لئے ڈاکٹر قمر رئیس ہیں لیکن ساری دنیا والے قمر رئیس کے مقابلے میں احمد پورہ کے چھکن اور شاہجہاں پور والا مصاحب علی ہمارے لئے زیادہ پرکشش ہے اور ڈاکٹر قمر رئیس سے تو کبھی کبھی ہم بیحد مایوس ہو جاتے ہیں۔

دوسری بار ترقی پسند تحریک کے سلسلے کی ایک تقریب میں شرکت کے لئے کراچی آئے تھے تو ایک ہوٹل میں صرف ایک بار چند لمحوں کے لئے ان سے ملاقات ہوئی تھی اور اس کے بعد ہم انہیں کراچی کی سڑکوں اور بڑے بڑے ادیبوں کی قیام گاہوں پر ڈھونڈھتے ہی رہ گئے تھے۔ مصاحب کے ساتھ ماضی

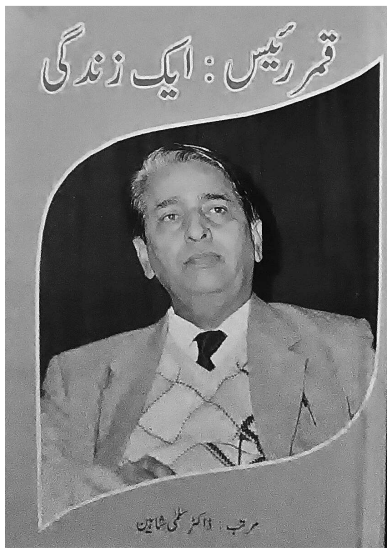

میں گزارے ہوئے تیز رفتار لمحے آج بھی دلفریب نقوش کی طرح دل و دماغ کے نگارخانے میں سجے ہوئے ہیں۔ اس طویل عرصے میں ہماری دوستی کی راہ میں کئی بار ناخوش گوار اور نازک مرحلے بھی آئے۔ بدگمانیوں نے بھی سر ابھارا، شکوہ شکایت کے بادل بھی گرجے برسے، اغیار کی فتنہ پردازیاں بھی سدراہ ہوئیں اور چاہے قمر رئیس وقتی طور پر کتنا ہی چیں بجبیں کیوں نہ رہا ہو، مصاحب علی کی محبت اور خلوص میں کوئی کمی نہیں آئی اور وہ اپنا ہی رہا۔

عصمت اللہ خاں
(صدر شعبۂ اردو، جناح کالج، کراچی)

سن ۵۰۔۵۱ء کے زمانے کے شہر شاہجہانپور سے قمر بھائی سے یاری کی روداد شروع کرتے ہوئے بہت سی یادیں، بہت سے چہرے اور بہت سے قصے نظروں کے سامنے سے گھومنے لگیں تو اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں کہ وہ عہد ہماری زندگی کا وہ فیصلہ کن زمانہ تھا جب ہم دوستوں کا انتخاب کرتے ہیں۔ ان کی دوستی کو زمانے کے سرد و گرم سے بچانے میں، اسے پروان چڑھانے میں جی جان سے لگ جاتے ہیں اور پھر ہمارا یہ انتخاب ہماری اس سرگرمی کا والہانہ پن اور دیوانگی کی حد تک اس جانب ہماری یکسوئی ہمیں زندگی کی ایک مخصوص ڈگر پر ڈال دیتی ہے۔ گویا ہمیں کیسے جینا ہے، کیسے مرنا ہے، کن قدروں کو رگ جاں کے قریب تر رکھنا ہے۔ غرض کہ ہمارے مستقبل کے کردار اور ہمارے افعال واعمال کا پورا خاکہ اسی زمانے میں تیار ہوتا ہے۔ بس یہی زمانہ تھا جب ماتھے پر بار بار گرنے والے بالوں کو ہاتھ کے جھٹکے سے پیچھے کرتے رہنے والے سائیکل سوار ایک نوجوان پٹھان زادے سے ہماری ملاقات ہوئی۔ کھلی کھلی سی آنکھوں اور بھرے بھرے ہونٹوں والی یہ شخصیت جس کی اپنی کاشت تھی، کھلے سے میدان میں کھیتوں کے قریب ایک قدیم طرز کا رہائشی مکان تھا، ٹریکٹر اور ٹیوب ویل

تھا، نوکر چاکر تھے، مطالعہ اور شعر و شاعری کا شوق تھا، بے پایاں محبت اور خلوص۔

لکھنؤ میں اس وقت ادیبوں اور ادب دوستوں کا زبردست جماؤ تھا۔ ہمارے یاروں میں سرفہرست قمر بھائی تو تھے ہی، لیکن ادبی لپاڈگی کرنے والوں میں احمد جمال پاشا، حسن عابد، سبط اختر، قاضی عبد الستار، رضوان حسین، انجم الحسن، آغا سہیل، عابد سہیل، والی آسی، عثمان غنی، شوکت عمر اور قیصر تمکین وغیرہ شامل تھے۔ ان میں سے کچھ تو ایسے تھے جو ہمارے ہم عمر تھے اور کچھ ایسے بھی تھے جو کم عمر تھے اور ہمارے ان کے درمیان محض ادبی قدر مشترک کے سبب بے تکلفی اور یارانہ تھا۔

ادب سے ہماری رغبت، کتابوں سے ہماری دلچسپی، نشستوں میں ہماری رسائی، ادیبوں اور نقادوں سے ہمارا معانقہ اور بحث و مباحثے غرض کہ ہر ادبی اور علمی سرگرمی کی داغ بیل شاہجہانپور کے مختصر قیام میں پڑی لیکن جیسا کہ عرض کر چکا ہوں کہ زندگی کی راہ متعین کرنے کے لئے جو دوست بنائے جاتے ہیں وہ ایک ایسے رشتے میں بندھ جاتے ہیں جو خونی رشتوں سے بھی زیادہ پائدار اور بے غرض ہوتے ہیں۔

اقبال مجید

قمر رئیس لکھنؤ یونیورسٹی میں پڑھتے تھے۔ 'اختر لاج' میں رہا کرتے۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کے جلسے میں جب یہ جاتے تو سب کو جمع کر کے اپنے ساتھ لے جاتے، عموماً واپسی میں سب شاعر، ادیب ان کے کمرے میں جمع ہو جاتے، نوجوان ادیبوں کے یہ سپہ سالار تھے۔ بڑے لئے دئے رہتے، گھنٹوں خاموشی سے پڑھتے لکھتے رہتے۔ ہم سب کے حوصلے بڑھاتے۔ غرض یہ ہم سب کے بھائی تھے۔

اس زمانے میں کرتا پاجامہ یا شیروانی پہنتے، مجاز اسٹائل سے سر کے بالوں کو درست کرتے یا اپنے مفلر کو ٹھیک کرتے۔ شاعری کا بھوت ان پر سوار تھا۔ ان کے چہرے پر نمک اور بھولا پن تھا۔ بڑی بڑی غضب کی آنکھیں، یونیورسٹی کی سب سے خوبصورت لڑکی جسے دیکھنے کے لئے لڑکوں کے جھنڈ ہوتے، سب باادب، باملاحظہ اور وہ قاتل بڑے وقار سے غرارہ سنبھالتی ہوئی گزر جاتی۔ ہمارے معصوم اور نازک دلوں پر یہ بجلی اس وقت گرتی جب وہ گھنٹوں انہیں ٹہلاتی۔ جب ان کی مجلس جمتی تو یہ مزے لے لے کر گھٹنے کھجا کھجا کر جنس پر نہایت نازک اور لطیف اور دلکش گفتگو کرتے۔

اس زمانے میں کرتا پاجامہ یا شیروانی پہنتے، مجاز اسٹائل سے سر کے بالوں کو درست کرتے یا اپنے مفلر کو ٹھیک کرتے۔ شاعری کا بھوت ان پر سوار تھا۔ ان کے چہرے پر نمک اور بھولا پن تھا۔ بڑی بڑی غضب کی آنکھیں، یونیورسٹی کی سب سے خوبصورت لڑکی جسے دیکھنے کے لئے لڑکوں کے جھنڈ ہوتے، سب باادب، باملاحظہ اور وہ قاتل بڑے وقار سے غرارہ سنبھالتی ہوئی گزر جاتی۔ ہمارے معصوم اور نازک دلوں پر یہ بجلی اس وقت گرتی جب وہ گھنٹوں انہیں ٹہلاتی۔ جب ان کی مجلس جمتی تو یہ مزے لے لے کر گھٹنے کھجا کھجا کر جنس پر نہایت نازک اور لطیف اور دلکش گفتگو کرتے۔ ان حضرت نے ایک اور عشق بیحد تاریخی کیا۔ خواہ یہ کتنے ہی معزز کیوں نہ ہو جائیں لیکن بلا اس تذکرے کے ان کی داستان حیات ادھوری سمجھی جائے گی۔

ان حضرت نے ایک اور عشق بیحد تاریخی کیا۔ خواہ یہ کتنے ہی معزز کیوں نہ ہو جائیں لیکن بلا اس تذکرے کے ان کی داستان حیات ادھوری سمجھی جائے گی۔ ہم ان کے دوسرے عشق کو اس لئے نظر انداز کرتے ہیں کہ عاشق تو یہ صرف اسی عشق میں ہوئے بقیہ میں لڑکیاں اور عورتیں ان پر ہوتی رہیں۔ تو جب ظالم سماج درمیان میں آ گیا تو انہوں نے اپنا تانگہ نکالا، بندوق نکالی، بھری ہوئی بندوق اور جب یہ ہیروئن کے پچھواڑے پہنچے تو ہیروئن کوٹھے پر سے پھاند پڑی۔

انہوں نے اس ماہ جبیں کو کھینچ کر لیا۔ تانگہ واپس روانہ ہوا جس میں سے یہ سکندر اعظم کے ڈائیلاگ بولتے رہے اور اسی وقت اس سے نکاح پڑھوا کر اسے حلال کیا اور آج بھی وہ ان کی رفیقۂ حیات اور مستقل محبوبہ ہیں۔

احمد جمال پاشا

دوستوں کے بارے میں کچھ کہنا آسان نہیں ہوتا۔ قربتوں میں غیر مرئی دوریاں ہوتی ہیں اور دوریوں میں قربتیں۔ اسی لئے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ہم قریب سے مکمل تصویر نہیں دیکھ سکتے، جزئیات کا احاطہ ضرور کر سکتے ہیں مگر وہ بھی اتنا آسان کہاں ہوتا ہے جتنا صرف کہہ دینا۔ علی گڑھ پہنچ کر اس کا احساس اور زیادہ شدت سے ہوا۔ خاص طور پر اس لئے بھی کہ میں قاضی عبد الستار اور قمر صاحب جیسے ساتھیوں کو دیکھتا تھا اور یک گونہ ان پر رشک کرتا تھا۔

قمر رئیس سے دوستی کرنے کو بھی جی چاہا لیکن قمر اور قاضی عبد الستار دونوں ہی مجھ سے تکلف برتتے تھے۔ محمود الٰہی نے سب سے پہلے اس طلسمی حصار کو توڑا اور مجھ سے دوستانہ باتیں شروع کیں۔ بالآخر نسیم قریشی نے خصوصیت کے ساتھ مجھے قمر صاحب سے متعارف کرایا اور یہ کہا کہ انہیں بھی اپنے 'حسن سوٹ' گروہ میں شامل کیجئے۔ قمر صاحب مسکرا دئے اور بات ختم ہو گئی لیکن قمر صاحب کا رویہ شدہ شدہ بدلنے لگا۔

قمر رئیس آج بھی ایک متین، سنجیدہ مزاج اور بھاری بھرکم انسان ہیں۔ اس وقت کی صورت کچھ اور تھی، چھریرا بدن، کھلتا ہوا گندمی رنگ، کشادہ پیشانی، بڑی بڑی آنکھیں اور پیشانی پر بار بار بکھرتے اور لہراتے ہوئے خوبصورت بال، چال میں یک گونہ سرشاری کا سا عالم، گفتگو میں ایک خاص متانت اور خود اعتمادی، جس کا طلسم کبھی کبھی ان کے شگفتہ قہقہوں سے ٹوٹتا تھا۔

ڈاکٹر تنویر احمد علوی

قمر رئیس کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے مجھے ہر بار یک گونہ سرخوشی حاصل ہوتی ہے۔ کچھ افراد کی بڑائی اور اہمیت اس سادہ سے اصول میں پوشیدہ ہے کہ ان کے بارے میں دوستوں کا رویہ کیا ہے اور وہ انہیں ان کے غیاب اور حضوری میں کس طرح یاد کرتے ہیں۔ قمر رئیس میرے چند عزیز و دستوں میں سے ایک ہیں۔ ڈاکٹر قمر رئیس جدید اردو ادب کے نقادوں کی تیسری پیڑھی سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ اس وقت برصغیر میں پروفیسر سید احتشام حسین کے تنقیدی مکتب فکر کے سب سے فعال اور موثر نقاد ہیں۔ ۱۹۵۹ء سے درس و تدریس میں مشغول ہیں۔ احتشام حسین نے جدید اردو ادب کو جن چند اہم ناموں سے روشناس کرایا تھا، قمر رئیس ان ناموں میں اس لئے بھی سرفہرست ہیں کہ ان کی کاوشیں اپنے استاد کی طرح صرف درس و تدریس تک محدود نہیں رہی ہیں بلکہ وہ ایک زمانے سے اردو ادب میں ترقی پسند تحریک کی علم بردار تنظیم (انجمن ترقی پسند مصنفین) کے جنرل سکریٹری کے فرائض کی انجام دہی میں مصروف ہیں۔ تدریسی و تصنیفی اور تنظیمی ذمہ داریوں سے خط اعتدال نہ کھینچ پانے کی وجہ سے بظاہر بعض جوانوں سے زیادہ نظر آتے ہیں لیکن یہ حقیقت بھی اپنی جگہ مسلم ہے کہ قمر رئیس کی اولوالعزمی نے صحت کے عام قوانین کو خاصہ متاثر کر رکھا ہے۔

محمد علی صدیقی

ایم اے ایل ایل بی کرنے کے بعد ۱۹۵۵ء میں قمر رئیس پی ایچ ڈی کرنے کے لئے علی گڑھ پہنچے۔ اس وقت علی گڑھ کی فضا بہت روشن تھی۔ وہ علی گڑھ رشید احمد صدیقی، خورشید الاسلام، معین احسن جذبی، مونس رضا اور اختر انصاری کا علی گڑھ تھا۔ پھر انہیں دنوں آدھا لکھنؤ علی گڑھ اٹھ آیا تھا یعنی پروفیسر عبدالعلیم، پروفیسر آل احمد سرور اور ڈاکٹر محمد حسن وامق جونپوری بھی سرکاری نوکری کا جوا اتار کر بمبئی اور دہلی کی خاک چھاننے کے بعد علی گڑھ میں متمکن ہو گئے۔ خلیل الرحمن اعظمی اور راہی معصوم رضا جیسے نوجوان بھی کچھ کم سرگرم نہیں تھے۔ معاصرانہ چشمکیں ادبی سرگرمیوں کے فروغ کا باعث بنتی ہیں، اگر اعتدال کی حد تک ہوں۔ جہاں ایک کیمپس میں اتنے سارے جید عالم ہوں معاصرانہ چشمکیں قدرتی امر ہے۔ قمر رئیس اس وقت طالب علم تھے اور ان کا یونیورسٹی کی ادبی سرگرمیوں میں فعال ہونا قدرتی بات تھی۔ ان کا ترقی پسند ہونا بھی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں تھی اس لئے انہیں پروفیسر عبدالعلیم اور پروفیسر آل احمد سرور اور ڈاکٹر محمد حسن کی پشت پناہی

انہیں نیشنل لکچرر بننے کا اعزاز حاصل ہوا۔ کل ہند اردو ٹیچرز ایسوسی ایشن کے وہ چار بار جنرل سکریٹری بھی چنے گئے۔ کلکتہ یونیورسٹی کی اقبال چیئر کی پروفیسر شپ بھی انہیں فیض احمد فیض کے انکار کے بعد پیش کی گئی۔ شاید ذاتی وجوہ کی بنا پر وہ وہاں نہیں گئے اور دہلی یونیورسٹی ہی میں پروفیسر ہو گئے اور چھ سال شعبۂ اردو کے صدر بھی رہے۔ ان کی نگرانی میں کئی ہونہار طلباء نے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ گویا اس ایک چراغ سے کتنے ہی چراغ ادب میں روشن ہوئے۔ مثلاً ڈاکٹر امیر اللہ خاں شاہین (مرحوم)، ڈاکٹر خاور ہاشمی، ڈاکٹر ارتضیٰ کریم، ڈاکٹر خالد اشرف، ڈاکٹر نکہت ریحانہ، سلمیٰ شاہین، رضی الرحمن، سہیل وحید اور سراج اجملی وغیرہ۔ ان کی مقبولیت محض ان کے یونیورسٹی کے عہدے کی وجہ سے نہیں ہے۔ پروفیسر اور صدور شعبہ تو اور بھی بنے۔ مگر وہ بات کہاں۔

حاصل تھی۔ انہوں نے ادبی سیاست، معاملہ فہمی، توازن اور میانہ روی علی گڑھ سے سیکھی اور ہم چشموں میں امتیاز و اعتبار حاصل کیا۔

علی گڑھ میگزین اور جامعہ اردو کے ماہنامہ 'ادیب' کے ایڈیٹر بھی رہے۔ قمر رئیس نے علی گڑھ کی ادبی روایت کو جدید ماحول کو بھی اپنی فکر میں جذب کیا، وہاں رہ کر 'پریم چند کا تنقیدی مطالعہ' کیا اور اس تحقیقی مقالہ پر انہیں پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض کی گئی۔

دہلی یونیورسٹی کے ارباب حل و عقد نے اس گوہر کو پہچانا اور ۱۹۵۹ء میں وہ شعبۂ اردو کے استاد مقرر ہوئے اور ترقی کی منازل طے کرتے ہوئے آج پروفیسر بن چکے ہیں اور عالمی شہرت کے حامل ادیب و دانشور ہیں۔

انہیں نیشنل لکچرر بننے کا اعزاز حاصل ہوا۔ کل ہند اردو ٹیچرز ایسوسی ایشن کے وہ چار بار جنرل سکریٹری بھی چنے گئے۔ کلکتہ یونیورسٹی کی اقبال چیئر کی پروفیسر شپ بھی انہیں فیض احمد فیض کے انکار کے بعد پیش کی گئی۔ شاید ذاتی وجوہ کی بنا پر وہ وہاں نہیں گئے اور دہلی یونیورسٹی ہی میں پروفیسر ہو گئے اور چھ سال شعبۂ اردو کے صدر بھی رہے۔ ان کی نگرانی میں کئی ہونہار طلباء نے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ گویا اس ایک چراغ سے کتنے ہی چراغ ادب میں روشن ہوئے۔ مثلاً ڈاکٹر امیر اللہ خاں شاہین (مرحوم)، ڈاکٹر خاور ہاشمی، ڈاکٹر ارتضیٰ کریم، ڈاکٹر خالد اشرف، ڈاکٹر نکہت ریحانہ، سلمیٰ شاہین، رضی الرحمن، سہیل وحید اور سراج اجملی وغیرہ۔ ان کی مقبولیت محض ان کے یونیورسٹی کے عہدے کی وجہ سے نہیں ہے۔ پروفیسر اور صدور شعبہ تو اور بھی بنے۔ مگر وہ بات کہاں۔

رفعت سروش

۱۹۷۷ء میں مجھے ان کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ جب انہی کی دعوت پر میں تین ماہ کے لئے دہلی میں وزیٹنگ پروفیسر ہو کر آیا۔ قمر صاحب ہی نے میرے لئے یہ انتظام کرایا تھا ورنہ یہ رتبہ یونیورسٹیوں میں بھلا غیر صدر شعبہ کو کہاں ملتا ہے اور میں تو اس وقت صرف ریڈر تھا مگر قمر صاحب نے مجھے یہ اعزاز دلوایا جس نے میری زندگی میں علم و ادب کی ایک نئی دنیا کھول دی کہ مجھے بیک وقت دہلی کی تین یونیورسٹیوں کے اساتذہ سے ملنے کے مواقع ہاتھ آئے اور بہت سے علمی و ادبی مذاکروں میں برابر شرکت کرنے کا شرف بھی حاصل ہوا جس میں اقبال پر وہ عالمی کانفرنس بھی شامل تھی جس میں راقم نے مختلف دانشوروں کے

ساتھ جرمنی کی مشہور خاورشناس اناماری شیمل سے بھی ملاقات کی۔قمر صاحب ہی کی خواہش پر میں نے اقبال پر اس سیمینار کے لئے ایک مقالہ 'اقبال کے شاہین کا ایک اور مطالعہ' بھی لکھا مگر یہ مقالہ سیمینار میں پیش نہ کیا جا سکا۔شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی قمر رئیس صاحب کے دور صدارت میں بیحد فعال ہوا، طرح طرح کے مذاکرے، باہر سے شعراء اور ادباء کی دہلی یونیورسٹی میں آمد، ادبی بحث ومباحثوں کی آج کل کی زبان میں 'ہوڑ سی' لگ گئی۔ اردو تعلیم کے مسائل پر سیمینار، اقبال عالمی کانفرنس میں دہلی یونیورسٹی کا اشتراک، عبادت بریلوی، ڈاکٹر وحید قریشی اور ڈاکٹر جمیل جالبی صاحبان کے شعبۂ اردو میں لکچرر، نظام لکچر پھر ہر ہفتے شعبے میں ایک خاص موضوع پر سیمینار جس میں کسی استاد کا مقالہ اور پھر اس پر بحث و مباحثہ یا دہلی کی دوسری یونیورسٹیوں کے اساتذہ کو شعبۂ اردو میں بلا کر ان کے لکچر کرانا، یہ سب قمر رئیس صاحب کے دورِ صدارت میں ہی ہوا۔ان سرگرمیوں کو دیکھ کر شعبۂ اردو کے ایک استاد، پروفیسر مغیث الدین فریدی نے ایک مصرعۂ تاریخ بھی نکالا۔مصرعہ حافظ کے نام سے مشہور ایک غزل کا تھا۔'این چہ شوریست کہ در دور قمری بینم' میرا خیال ہے کہ خواجہ احمد فاروقی صاحب کے بعد دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کو جو شہرت اس 'دور قمر' میں ملی اتنی کبھی نہ مل سکی۔

پروفیسر سید عقیل رضوی

ڈاکٹر قمر رئیس صاحب نے تاشقند یونیورسٹی (سویت یونین) کے شعبۂ اردو میں مہمان پروفیسر کی حیثیت سے ۱۹۶۲ء سے ۱۹۸۳ء کے دوران چار بار کام کیا۔قمر صاحب کے لیکچرس کا معیار اتنا بلند رہا کہ ان کو سننے کے لئے نہ صرف شعبۂ اردو کے طلبہ اور اساتذہ آتے تھے بلکہ شرق شناسی کے انسٹی ٹیوٹ کے بڑے بڑے اسکالرز بھی۔ پروفیسر قمر رئیس ہم عصر اردو ادب اور زبان کی گہری واقفیت رکھتے ہیں۔ اکثر وہ اپنی معلومات سویت اسکالرز تک پہنچانے کے لئے مختلف انداز اختیار کرتے۔ ان کی زبان کی روانی، مضمون سے گہری واقفیت اور ادب شناسی سننے والوں کے دل موہ لیتی تھی۔ میں سمجھتی ہوں کہ تاشقند یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے استاد کی حیثیت سے ان کی خدمات ناقابل فراموش رہی ہیں۔قمر صاحب کی یہ بڑائی ہے کہ تاشقند میں بتائے ہوئے چھ سالوں میں کوئی اسکالر ایسا نہ تھا جس نے اپنے علمی کام میں قمر صاحب سے مدد نہ لی ہو۔ طالب علموں کے ساتھ ان کا وہ سلوک تھا جو بڑے بھائی اور چھوٹے بھائی کے درمیان ہوتا ہے۔

قمر رئیس صاحب کے تاشقند میں رہنے سے سوویت یونین کے اردو اسکالرز کو جتنا فائدہ پہنچا وہ لفظوں میں بتانا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ پروفیسر شاماتوف، ڈاکٹر تاش مرزا، ڈاکٹر فتح تیشا بائف، ڈاکٹر نبی محمد دف وغیرہ نے قمر صاحب سے اپنے ڈاکٹریٹ کے کام کے سلسلے میں ضروری مدد لی اور پروفیسر اور ڈاکٹر بنے۔ تاشقند یونیورسٹی جب اپنے محسنوں کے نام یاد کرے گی تو قمر صاحب کا نام نمایاں ہوگا۔قمر صاحب نے ہمیشہ اپنے وطن کو اچھی طرح جاننے اور سمجھنے میں ہماری مدد کی ہے۔اپنے ذاتی تعلقات میں وہ چھوٹے اور بڑے آدمی کا امتیاز نہیں برتتے تھے۔ ان کا گھر ہمیشہ سب کے لئے یکساں کھلا تھا۔ان کی بیگم بانو صاحبہ ہندوستانی کھانے پکاتے رہنے سے اور مہمانوں کو کھلاتے رہنے سے کبھی تھکتی معلوم نہیں ہوتی تھیں۔ وہ جانتی تھیں کہ ہم میں سے کس کو کھانے کی کیا کیا چیز مرغوب ہے۔

تاشقند میں رہ کر قمر صاحب نے روسی اور ازبیک دونوں زبانیں سیکھیں مگر اپنے سوویت شاگردوں کے ساتھ انہوں نے ہمیشہ صرف اردو میں ہی بات کی۔ ان سے ہمارے تعلقات کو پچیس سال سے زیادہ زمانہ ہو گیا۔

ڈاکٹر سونیا چیرنی کووا

نوٹ:

مرکزی وزارت تعلیم، حکومت ہند کے ہندی، روسی ثقافتی تبادلے کے پروگرام کے تحت روسی شعبۂ السنہ اور فیکلٹی آف اسٹیٹ یونیورسٹی تاشقند میں بحیثیت مہمان پروفیسر رہے۔

مارچ ۱۹۹۷ء میں بھی بحیثیت ڈئرکٹر، انڈیا کلچرل سینٹر، سفارت خانۂ ہند، تاشقند گئے۔

نقدنامہ

قمر رئیس کی ادبی زندگی کا آغاز شاعری سے ہوا۔ کچھ کہانیاں بھی لکھیں اور آخر تنقید کی طرف جو مائل ہوئے تو ایک یوگی کی طرح تپسیا کر ڈالی کہ اب پریم چندر پران کی رائے کو حرف آخر سمجھا جاتا ہے۔

پریم چند کے ادب کو ہر زاویۂ نگاہ سے پرکھنے کے بعد قمر رئیس اس نتیجے پر پہنچے کہ پریم چند بحیثیت فنکار شعوری طور پر ایسے ادب کی تخلیق کرنا چاہتے تھے اور ایسی دنیا کے خواب دیکھتے تھے، جس میں پورا انسانی معاشرہ آپسی میل جول، امن وآشتی اور محبت کے ساتھ بہتر زندگی جی سکے۔اس طرح ڈاکٹر قمر رئیس نے 'پریم چند کا تنقیدی مطالعہ' سے لے کر تلاش وتوازن تنقیدی تناظر اور اردو میں طنز ومزاح کی روایت تک ایک لمبا سفر طے کیا ہے جس میں بحیثیت نقاد یہ اس وقت اس صف میں دکھائی دیتے ہیں جہاں ان کے پیشرو پروفیسر احتشام حسین، آل احمد سرور اور ڈاکٹر محمد حسن جیسے لوگ رونق افروز ہیں۔اپنے ہم عمروں میں شمس الرحمن فاروقی نے جس طرح ادب میں جمالیاتی پہلو کو تلاش کرنے کی کوشش کی ہے، انہیں پسند ہے اور یہ محسوس کرتے ہیں کہ ترقی پسند ادیبوں سے یہ پہلو چھوٹ گیا تھا۔

رتن سنگھ

قمر رئیس کی تنقید اپنے بہترین کردار میں تنقید ہے جو تنقید سے معیار اخذ نہیں کرتی اور نہ ہی فلسفیانہ وضاحتیں پیش کرتی ہے بلکہ براہ راست تخلیق سے سروکار رکھتی ہے۔

قمر رئیس نے بالعموم انہی فنکاروں پر لکھا ہے جو اپنے ادراک میں واضح اور فکر میں سنجیدہ ہیں۔ جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں کہ ان کے مطالعات میں تاریخ، سماج اور تہذیب کو اولیت حاصل ہے جن سے ان سے ایک خاص نقطۂ نظر کی تشکیل ہوتی ہے مگر وہ نقطۂ نظر کو بنیاد بنا کر تخلیق کا مطالعہ نہیں کرتے بلکہ تخلیق میں اپنا نقطۂ نظر تلاش کرتے ہیں اور تخلیق ہی سے اس کا اثبات بھی چاہتے ہیں۔ قمر رئیس کی تنقید ہی کیا، میری نظر میں ایسی کسی تنقید کا وجود ہی نہیں جو نقاد سے تصور یا تعصب سے پاک ہو یا جسے قطعاً غیر جانبدار تنقید کا نام دیا جاسکتا ہو۔ قمر رئیس کی تنقید ایک ایسی شخصیت کی تنقید ہے جو واضح اور دوٹوک ہے اور جسے اپنے نظریئے کی روشنی میں ادب کی تعبیر و تحلیل میں یک گونہ طمانیت حاصل ہوتی ہے اور جو اس نکتہ سے بھی آگاہ ہے کہ ادب میں بڑبولا پن اور فریب بہت دور اور دیر تک برقرار نہیں رہتا، ایک خاص مہلت میں سارا غبار چھٹ جاتا ہے اور چیزوں کے اپنے اصلی خد و خال نمایاں ہو جاتے ہیں۔ میں نے کسی جگہ لکھا تھا کہ قمر رئیس کی تنقید ہمارے عہد کی وسیع تر بصیرتوں کا ایک معتبر حوالہ ہے۔ اردو میں فکشن کی تنقید کے اولین بنیاد گزاروں میں قمر رئیس کا نام ایک علیٰحدہ تخصص رکھتا ہے۔

قمر رئیس میرے لئے ان چند گنے چنے ناموں میں سے ایک ہیں جن کی تنقید نے ہمیشہ میری توجہ کو برقرار رکھا ہے۔ اس لئے نہیں کہ وہ میرے استاد ہیں، میرے بزرگ ہیں یا میرے رفیق کار ہیں یا اس لئے کہ ان کے بعض ادبی نظریات سے میں متفق ہوں بلکہ اس لئے کہ اپنی تنقید میں جس قدر یکسو، پر اعتماد اور مرتکز دکھائی دیتے ہیں اور جس طرح ایک گہری متانت نیز اپنی نظریاتی توجہات کے باوجود تخلیقی ذہانت کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ انکے معاصرین میں کم ہی نظر آتی ہے۔

پروفیسر عتیق اللہ

قمر رئیس کی تنقید نگاری پر سب سے زیادہ اثرات ترقی پسندانہ فکر کے عالمی نقطۂ نظر نے ڈالے ہیں۔ ہر چند کہ وہ پروفیسر احتشام حسین کے شاگرد ہیں لیکن احتشام حسین اور قمر رئیس کے اسالیب میں بین فرق ہے۔ احتشام حسین کی تنقید کا رویہ خالصتاً سائنسی تھا۔ وہ اپنے مطالعہ پر اپنے تنقیدی نقطۂ نظر کا اطلاق کرتے ہوئے غیر جانبدار نظر آتے ہیں۔ غیر جانبداری کا رویہ کتنا ہی غیر شعوری ہو، وہ بہرحال متخیلہ کے شاعرانہ بیان سے کتراتا ہے، رشید احمد صدیقی کے اسلوب میں 'ڈھائی گھر والی چال' کا نادانستہ التزام نظر آتا ہے خواہ یہ سب کچھ التزاماً نہ ہو لیکن احتشام حسین اپنے ادبی مطالعہ میں فنی محاسن نقطۂ نظر اور جمالیاتی احساس کی جس تثلیث پر زور دیا کرتے تھے، قمر رئیس کے یہاں یہ تثلیث جوں کی توں برقرار ہے۔

'پریم چند کا تنقیدی مطالعہ' ۱۹۵۹ء 'تنقیدی تناظر' ۱۹۷۷ء 'پریم چند فکر و فن' ۱۹۱۸ء 'تلاش و توازن' ۱۹۶۸ء 'اردو ڈرامہ' ۱۹۶۲ء 'ہندوستانی ادب پر اکتوبر انقلاب کے اثرات' (بزبان انگریزی) ۱۹۷۷ء 'ترجمہ کا فن اور روایت' ۱۹۷۱ء 'رتن ناتھ سرشار' کے علاوہ سید عاشور کاظمی کے ساتھ 'ترقی پسند ادب پچاس سالہ سفر' ۱۹۸۸ء کے علاوہ متعدد درسی کتب کی تدوین بھی قمر صاحب نے کی ہے۔ تاشقند میں قیام کے دوران قمر رئیس نے شعراء ازبکستان کے عنوان سے ۲۵/ازبکی شعراء کی ۷۰ سے زائد تخلیقات کا اردو میں ترجمہ کیا۔ قمر رئیس کی متعدد کتابوں کے سوویت زبانوں میں تراجم بھی ہوئے ہیں۔ ان کتابوں میں خود قمر رئیس کی اردو شاعری کا ترجمہ بھی شامل ہے جس کا مقدمہ سید سجاد ظہیر نے تحریر کیا ہے۔

عصمت اللہ خاں، کراچی

قمر رئیس نے اپنی تنقید میں جس تلاش و تفحص کے جذبہ کو اساسی پہلو قرار دیا ہے وہ اسی جدلیت سے پیدا ہوتی ہے۔ جو مارکسزم کی ایک بڑی دین ہے۔ ادبی سرمایہ کے محرکات اور اقدار کی بازیافت کی ساری کوشش تخلیقی عمل سے گزر کر سامنے آتی ہے۔ قمر رئیس کے یہاں یہ تنقیدی عمل، تخلیق سے گہرا رشتہ رکھتا ہے مگر اس اعتدال و توازن کے ساتھ جو تنقید کی اہم شناخت ہے۔ پریم چند سے 'عصری آگہی' کے مضامین تک قمر رئیس نے جمالیاتی اقدار اور فنی روایات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ جمالیات کے افادی پہلوؤں کا مطالعہ کیا جائے اور حسن ماورائی کا تصور ہمیشہ پیش نظر نہ رکھا جائے۔ اعلیٰ ادب میں تہہ داری ہوتی ہے۔ اس کی معنویت ہر دور میں زندہ رہتی ہے اور یہ سب صرف سماجی حقیقتوں کے اظہار سے وجود میں نہیں آتی۔ قمر رئیس کو یہ احساس ہے کہ محض خارجیت کی تشریح و تاویل سے تنقید پیدا نہیں ہوتی بلکہ اس داخلی کرب کا بھی مشاہدہ ناقد کے لئے ضروری ہے جس سے کوئی بڑا فنکار اپنے تخلیقی عمل کے دوران گزرتا ہے۔

ش اختر

قمر رئیس کے ادراک میں شریک ہونے میں نہ تو ذہن گرانبار ہوتا ہے اور نہ ہی ایک رخ پر سرپٹ بھاگنے کی تھکن کا احساس ہوتا ہے۔ اس کی وجہ صاف ہے کہ ان کے موضوعات متنوع ہیں اور اسلوب شگفتہ ہے۔ اسلوب میں شگفتگی کبھی کبھی ذہن کی نارسائی کی غلاف چڑھانے کے لئے بھی پیدا کی جاتی ہے یا کی جاسکتی ہے۔ خصوصاً اس وقت جب متعلقہ موضوع کے بارے میں اپنا ہی ذہن گنجلک ہو لیکن قمر رئیس اپنے ذہن کی صفائی اور بیان کی سچائی کے لئے معروف ہیں اس لئے ان کا اسلوب آئینہ کی طرح صاف اور شفاف ہے، چست اور رواں جملے، معنی کی شیرینی کو بڑھا دیتے ہیں، پیچیدگی اپنا راستہ لیتی ہے اور مفہوم کی ایک واضح دنیا نگاہوں کے سامنے ہوتی ہے۔ قمر رئیس اس مرحلے سے بھی شاداں و فرحاں گزر جاتے ہیں جب مسائل پیچیدہ اور تیکھے ہوتے ہیں۔ دراصل ان کی نثر وضاحتی ہونے کے باوجود ادبی ہے اور ان کی پوری شخصیت کا عکس ہے۔ میرے خیال میں لینن نے جو بھی اسلوب اور شخصیت کے تعلق سے اپنے مفروضات پیش کئے ہیں وہ سب کے سب قمر رئیس کے اسلوب اور شخصیت پر منطبق ہوتے ہیں۔ صاف تو یہ ہے

کہ قمر رئیس نئی ترقی پسند تحریک کے اہم ستون ہیں۔

وہاب اشرفی

عصری اردو تنقید جن چند ناموں سے عبارت ہے ان میں ایک اہم نام قمر رئیس کا بھی ہے۔ قمر رئیس نے ابتداً پریم چند پر توجہ دی اور پھر پریم چند ہی نہیں اردو افسانے کے نامور ناقد کی حیثیت سے، ان کا مقام بنا لیکن آج ان کی مرتبت صرف افسانے کی ناقد کی نہیں بلکہ ہمارے شعر و ادب کی دیگر اصناف اور مسائل پر بھی ان کی تحریریں قدر کی نگاہوں سے دیکھی جاتی ہیں۔

فکشن اور فکشن میں پریم چند کی تخلیقات قمر رئیس کا اہم موضوع رہا ہے۔ انہوں نے پریم چند کے حالات زندگی، ان کی شخصیت، ان کے افسانے اور ناولوں کے پس منظر اور ان کے فن کے مختلف پہلوؤں کا کئی زاویوں سے تجزیہ کیا ہے۔ اردو ہی نہیں، ہندی میں بھی پریم چندر کے سلسلہ میں قمر رئیس کی تحریریں عالی مقام رکھتی ہیں اور ان کے حوالے کے بغیر ظاہر ہے کہ پریم چند پر کوئی کام آگے نہیں بڑھایا جا سکتا۔

سلیمان اطہر جاوید

اپنے مضمون 'مارکسی تنقید، رجحان اور رویئے' (ترقی پسند ادب) میں مارکسی تنقید کی برتری کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''میں مارکسی تنقید کے طریق کار کو عصر حاضر کے دوسرے تنقیدی رویوں یا نظریوں کے مقابلے میں محیط، کارگر، نتیجہ خیز، علمی یا معروضی سمجھتا ہوں۔ اس لئے مارکسی تنقید کے تعلق سے میری تنقید میں پاسداری نہ سہی، پسندیدگی کا رویہ ضرور ملے گا۔''

مندرجہ بالا اقتباس کا آخری جملہ 'میری تنقید میں پاسداری نہ سہی، پسندیدگی کا رویہ ضرور ملے گا' بڑا معنی خیز ہے اور قمر رئیس کے تنقیدی نقطۂ نظر کو سمجھنے کے سلسلہ میں کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔ قمر رئیس نے جس زمانے میں تنقید کے میدان میں قدم رکھا، اس وقت بیشتر ترقی پسند نقاد جذباتی ہیجان میں مبتلا تھے۔ وہ انتہا پسندی کا شکار تھے اور شعر و ادب کو پرکھنے میں ادبی تقاضوں کو نظر انداز کر رہے تھے۔ شاید ہر تحریک کا یہی مقدر ہے کہ کسی خاص مقصد کی تحصیل کے لئے وہ ایسے جوش اور سرگرمی کا مظاہرہ کرتی ہے کہ اعتدال و توازن کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے۔ یہی بے اعتدالی اس کے زوال کا نقطۂ آغاز بن جاتی ہے۔ ترقی پسند تحریک، جو مارکسی تحریک کا ہندوستانی روپ ہے، کے ساتھ بھی یہی صورت حال پیش آئی۔ اس تحریک نے جہاں رہبری کا قابل قدر فریضہ انجام دیا وہیں وہ خود بھی گمراہ ہوئی اور قارئین کو بھی گمراہی میں مبتلا کیا۔ قمر رئیس کے الفاظ میں:

'اگر چہ اس حقیقت کو ماننے میں تامل نہیں ہونا چاہئے کہ مارکسزم نے جہاں ادبی تنقید کو ایک نیا تناظر اور نئی جہت دی وہاں اس کے طریق کار کو برتنے میں ادعائی اور میکانیکی انداز میں نمایاں رہا ہے۔' قمر رئیس نے ایک جگہ اس گمراہی کا تفصیل کے ساتھ ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

چنانچہ یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ قمر رئیس کا ادب سے پہلا مطالبہ یہ ہے کہ وہ ادب کی کسوٹی پر پورا اترے یعنی یعنی فن اور جمالیات کے تقاضوں کو کسی بھی صورت میں نظر انداز نہ کرے ورنہ ابدی اور آفاقیت سے محرومی اس کا مقدر ہوگی۔ شاعری سے فن اور جمالیات کے مطالبے کچھ زیادہ ہی ہوتے ہیں۔ شعر کی تخلیق میں سماجی حالات سے زیادہ داخلی محرمات کارفرما ہوتے ہیں:

قمر رئیس فرماتے ہیں:

''شاعر کا طرز احساس، اس کی شخصیت کی تہیں، تخیل کی نوبکیفیتیں، رمز و کنائے کی نزاکتیں اور ندرتیں شعر کی تخلیق میں نہایت اہم رول ادا کرتی ہیں۔''

یہ سب اپنی جگہ درست مگر وہ اپنے بنیادی موقف پر قائم رہتے ہیں کہ ادب خلا میں جنم نہیں لیتا اور اپنی دھرتی پر اس کے قدم لازمی طور پر ٹکے رہتے ہیں۔ مراد یہ کہ ادب کی تخلیق بہر حال ایک سماجی فعل ہے اور زندگی سے گہرا، بامعنی اور استوار تعلق ہی ادب کو توانائی عطا کرتا ہے۔ قمر رئیس ادب کو کوئی ایسی الہامی اور غیر ارضی شئے نہیں مانتے جو مادی زندگی سے کوئی علاقہ نہ رکھتی ہو۔ ان کے نزدیک وہ ادب بے وقعت ہے جو زندگی سنوارنے اور اسے بہتر بنانے کا آرزومند نہ ہو۔

پروفیسر نور الحسن نقوی

شعر نامہ

قمر رئیس کا بہت اہم مقام ہے۔ اس وقت وہ اردو کے مورخوں، نقادوں اور اس عہد کے معلموں میں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں لیکن ایک غیر معمولی بات یہ ہے کہ ان علمی مصروفیتوں کے ساتھ ساتھ انہوں نے اپنے ذہن و دماغ کی تروتازگی اور اپنی روح کی تڑپ اور تپیدگی کو بھی برقرار رکھا ہے جس نے ان کو شعر کی حسین غمازیوں کا بھی پرستار بنا دیا ہے۔ یعنی وہ بہت اچھے شاعر بھی ہیں۔ بڑے خلوص کے ساتھ یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جب بھی قمر رئیس کی کوئی نظم یا غزل ہمارے رسالوں یا اخبارات میں شائع ہوتی ہے تو ہم اسے ایک ادبی واقعہ سمجھتے ہیں۔ قمر رئیس ہمارے دانشوروں میں اس گروپ سے تعلق رکھتے ہیں اور اس کے ایک ممتاز رہنما ہیں جو اپنے عمل اور کاوش سے اس قومی فرض کو سمجھتے ہیں اور اس کے مطابق عمل کر رہے ہیں۔ وہ ترقی پسند تحریک کے ایک سرگرم رکن ہیں اور انجمن ترقی پسند مصنفین کی کل ہند مجلس عاملہ کے کارکن ہیں۔

سجاد ظہیر (۱۹۷۲ء)

میں قمر رئیس سے جب پہلی بار ملا تو وہ شاعر تھے۔ آج بھی میں انہیں بنیادی طور پر تخلیقی فنکار سمجھتا ہوں باوجود اس کے کہ منشی پریم چند پر ان کا کام بہت وقیع ہے۔ ڈاکٹریٹ کے لئے ان کا تحقیقی مقالہ 'پریم چند کی ناول نگاری کا تنقیدی مطالعہ' تھا۔

ان کی کئی کتابیں ہیں اور سب کا تعلق تنقید سے ہے۔ تازہ ترین تنقیدی مضامین کا مجموعہ 'تعبیر و تحلیل'

ہے۔قمر رئیس نے شروع کے دور میں کہانیاں بھی لکھی ہیں اور وہ اس رمز سے واقف ہیں کہ سماجی حقیقتوں کو کس طرح پیش کریں کہ فن پارہ وجود میں آئے۔ ان کی ساری شاعری بیانیہ نہیں ہے لیکن بیانیہ نظمیں اس اسلوب کی نظموں سے زیادہ ہیں جسے تغزل کے تحت رکھا جاسکتا ہے۔ایسی نظمیں غزل کے یا Extended غزل کے فارم میں بھی ہوسکتی تھیں، اگر قافیہ سے زیادہ صناعی پر زور دیا جاتا۔قمر رئیس ان چند سر برآوردہ شاعروں میں سے ہیں جن کی اردو نظم آل انڈیا ریڈیو نے National Symposium of Poets کے لئے منتخب کی تھی۔

یہ بڑی عجیب سی بات ہے کہ اردو میں ان کی نظمیں مجموعے کی صورت میں شائع نہیں ہوئیں لیکن تاشقند میں ان کی نظموں کا ترجمہ ازبکی زبان میں ہوا اور کتاب چھپی۔

ان کی نظم 'نیم شب' پر مجازؔ اور فیضؔ کے ڈکشن کے سائے ہیں اور ایسا ہونا بھی چاہئے کیونکہ اس نظم کے تانے بانے میں مجاز کی نظم 'آوارہ' اور فیض کی نظم 'تنہائی' دونوں کی فضا کا پرتو بھی ہے۔

قمقمے رات کی پہنائی میں اے روح مجاز
اک دہکتی ہوئی زنجیر نظر آتے ہیں
کچھ قدم اور سہی، اے دل وحشت ساماں
اپنی دیوانگی شوق کے ہاتھوں تو بھی
بے نوا، بے سروسامان رہا ہے اب تک
اپنی بستی میں بھی ویران رہا ہے اب تک
مجھ کو تنہائی کبھی اتنی گرانبار نہ تھی
ذہن میں تلخیٔ افکار تھی پیکار نہ تھی

ڈاکٹر کمال احمد صدیقی

قمر رئیس صرف مضمون نگار اور تنقید نگار ہی نہیں شعر بھی کہتے ہیں اور خوب کہتے ہیں۔ راقم الحروف نے انہیں سنا ہے اور آرزو ہے کہ ان کا شعری مجموعہ بھی شائع ہو۔ان کی شاعری کی سند کے طور پر 'تلاش وتوازن' میں شامل جدید ازبک شاعری پر ان کا مضمون دیکھئے۔ازبک نظموں کا انہوں نے اردو میں منظوم ترجمہ کیا ہے اور تاشقند سے ایسے کچھ منظوم ترجمے شائع بھی ہوئے ہیں۔ میں اس بات پر زور اس لئے دے رہا ہوں کہ قمر رئیس تخلیق کے کرب سے واقف ہیں اس لئے ان کی پرکھ اور بھی گہری اور جانبدار ہوتی ہے۔ ویسے تو ڈاکٹر قمر رئیس کے تنقیدی مضامین ادب کی سبھی اصناف کا احاطہ کئے ہوئے ہیں لیکن محسوس ہوتا ہے کہ نثری ادب اور خاص طور پر ناول اور افسانے سے ڈاکٹر قمر رئیس کو خاص انس ہے۔

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ

پروفیسر قمر رئیس کثیر الجہات شخصیت کے مالک ہیں۔ وہ محض ادیب اور نقاد ہی نہیں ہیں بلکہ افسانہ نگار اور شاعر بھی ہیں لیکن انہوں نے شاعری کو کبھی شناخت کا ذریعہ نہیں بنایا۔ نہ کبھی اپنا کلام محفوظ رکھا اور نہ ہی کوئی شعری مجموعہ شائع کرایا بلکہ اسے ذوقِ جمال کی تسکین، تخلیقی کرب کے اظہار، ذہنی وجذباتی کشمکش کے اخراج اور خلوت میں یادوں کی جلوہ گری تک ہی محدود رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی اکثر نظمیں اور غزلیں نامکمل اور ادھوری ہیں بلکہ آورد سے پاک ہیں اور اپنے فطری پن، بے ساختگی، تجربے ومشاہدے کی صداقت، اظہار کے خلوص، حرکت پذیری، خوبصورت تشبیہات اور زبان و بیان کی شگفتگی کی وجہ سے متاثر کرتی ہیں جن میں فطرت کے حسین مناظر اور انسانی حسن کی ایسی جلوہ سامانیاں بھی ہیں جو شدید ذہنی و جذباتی کشمکش کے باوجود اعصاب کو مضمحل اور جذبات کو پژمردہ نہیں ہونے دیتیں بلکہ فرحت اور مسرت کا احساس عطا کرتی ہیں جس سے نامساعد حالات میں زندگی کو حوصلہ ملتا ہے۔

عظیم الشان صدیقی

مکتوبات گرامی

مبارکباد! اردو تنقید کی دنیا میں ڈاکٹر قمر رئیس ایک مستند اور محترم نام ہے۔انہوں نے اپنی تحریروں سے ہزاروں دلوں میں علم کے چراغ روشن کئے ہیں اور ہزاروں دماغوں کو شعور کی روشنی عطا کی ہے۔ان کی روح میں ایک شاعر بھی موجود ہے لیکن انہوں نے اپنی تمام تر صلاحیتیں تنقیدی ادب کے لئے وقف کردیں اور شاعری کبھی کبھی منھ کا مزا بدلنے کے لئے کی۔ میں بعض اوقات علم کو شاعر پر ترجیح دیتا ہوں اور اگر وہ معلم بھی ہو جائے تو اس کا درجہ اور بلند ہوجاتا ہے۔ڈاکٹر قمر رئیس نے دہلی کی دانش گاہ میں اپنا فریضہ جس خلوص اور ایمانداری سے ادا کیا ہے اس کا ثبوت وہ محبت اور عقیدت ہے جس کا اظہار دہلی یونیورسٹی کے طالب علم اس وقت کررہے ہیں جب پروفیسر قمر رئیس اردو شعبہ سے طویل خدمات کے بعد سبکدوش ہورہے ہیں۔

میں وقت کی تنگی اور اپنی عمر اور صحت سے پیدا ہونے والی کوتاہ قلمی کی وجہ سے مضمون لکھنے سے قاصر ہوں۔ اس لئے قمر رئیس کی ادبی خدمات کا اعتراف کرنے پر اکتفا کررہا ہوں۔اس وقت میری نظر ان کے ماضی کے کارناموں پر ہے تو مستقبل کے امکانات پر بھی ہے۔اب ان کے پاس تخلیق کے لئے زیادہ وقت ہوگا۔ ایک زمانے میں یہ خبر سنی تھی کہ ڈاکٹر قمر رئیس ازبکستان میں بابر کی تخلیقات کا اردو ترجمہ کررہے ہیں۔اس میں بابر کی نظموں اور غزلوں کا ترجمہ کرنے میں ان کی شاعرانہ صلاحتیں بروئے کار آئیں گی۔ یہ ایک قابل قدر کام ہوگا۔ میں دہلی یونیورسٹی کے طالب علموں کے ساتھ ڈاکٹر قمر رئیس کی رخصت کے جشن میں شریک ہوں۔

علی سردار جعفری، ۴/اکتوبر ۱۹۹۶ء (ممبئی)

مائی ڈیئر قمر!

کل سلمیٰ شاہین کا خط ملا جس میں یہ فرمائش کی گئی تھی کہ میں تمہارے بارے میں ایک مضمون لکھ کر انہیں بھیج دوں۔ میری نظروں کے سامنے گزرے ہوئے زمانے کی یادوں کا ایک پورا جلوس گزر گیا۔آخر یہ نصف صدی کا قصہ ہے۔دو چار برس کی بات نہیں اور اس کے لئے تو اچھا خاص وقت چاہئے کہ پرانے نہاں خانوں سے ان پل دو پل میں روٹھ جانے والی یادوں کو نکالوں، سجاؤں اور بناؤں۔ جی بھی بہت چاہتا ہے کہ

یہ دو چار لمحے جو اب زندگی کے باقی رہے ہیں، ان کا رخ مستقبل کے بجائے ماضی کی طرف موڑ دوں اور یادوں کے سائے ہی میں جی لوں۔

دل وہاں بھی کچھ لمحے جانے کب گزار آیا

اب ان لمحوں کو احتیاط اور محبت سے چنوں تو تمہارا خاکہ بنے گا۔ نہیں کہتا کہ یہ خاکہ تمہیں اپنا لگے گا بھی یا نہیں، اس میں کچھ رنگ میرے اپنے بھی ہوں گے، زاویۂ نظر سمیت۔ کچھ ایسی باتیں بھی جو تمہیں اچھی نہ لگیں گی، مجھے بھی اچھی نہیں لگیں مگر اتفاق و اختلاف کی یہ دھوپ چھاؤں ہے بڑی کیف پرور اور دنیا کے سارے جانے انجانے رشتے اسے دھوپ چھاؤں سے گزرتے ہیں لیکن کیا کروں! نہ وقت پر اپنی حکومت ہے نہ ذہن پر۔

محمد حسن، ۳۰/اگست ۱۹۹۷ء (دہلی)

عزیزی سلمہ شاہین صاحبہ

تسلیمات۔ آپ کا ۱۰/جولائی ۱۹۹۶ء کا محررہ ایروگرام مجھے اب اتنے عرصہ کے بعد ملا، اس تاخیر کے لئے ہم آپ دونوں نہ تو معذرت خواہ ہیں اور نہ شرمسار کہ اس کا ذمہ دار محکمۂ ڈاک ہے جو ہم سے کبھی معذرت خواہ نہیں ہوگا۔ لے دے کر خمیازہ اس کتاب کو بھگتنا پڑے گا جو آپ کی نگرانی میں مدون ہو رہی ہے اور غالباً تسوید ہے۔ یہ مضمون نہیں صرف نیک خواہشات ہیں۔

پروفیسر قمر رئیس کی ہمہ جہت شخصیت کم از کم اردو داں طبقہ کے لئے محتاج تعارف نہیں۔ وہ ایک مقبول استاد، معروف نقاد، ممتاز شاعر اور ترقی پسند تحریک کو تنظیم بنانے والے ایک فعال ادیب ہیں۔ سجاد ظہیر اور علی سردار جعفری کے بعد اس میدان کے وہ اکیلے سپاہی ہیں جو اب تک میدان میں ڈٹے ہوئے ہیں۔ صرف برصغیر کے ممالک کے شہروں ہی میں نہیں، امریکہ، روس، کنیڈا اور یورپ کے ملکوں اور شہروں تک میں انہوں نے وقتاً فوقتاً کانفرنسیں اور سیمینار منعقد کر کے دانشوروں میں یکجہتی پیدا کی جو بجائے خود ایک منفرد کارنامہ ہے جسے ادب کی تاریخ میں نمایاں مقام حاصل رہے گا۔

سہیل آغا، ۲۰/اگست ۱۹۹۶ء (لاہور)

محترمہ تسلیم

آپ کا خط مل گیا تھا۔ افسوس اپنی علالت کے سبب جواب میں اس قدر تاخیر ہوئی لیکن اس کے قبل آپ کا کوئی خط نہیں ملا تھا۔ پیغام وغیرہ تو بڑے لوگوں کے چھاپئے۔ میری تحریر پر پورا صفحہ ضائع نہ کیجئے۔ ہاں کسی مضمون کے آخر میں جگہ بچے تو آپ حسب ذیل تحریر ضرور شائع کر دیں، کرم ہوگا۔

قمر رئیس شاعر بھی نہایت عمدہ ہیں۔ افسوس انہوں نے اس جانب سنجیدگی سے توجہ نہیں کی۔ اس کے باوجود ان کا شعری سرمایہ اتنا ضرور ہے کہ کتابی صورت میں شائع کیا جائے۔ یہ کام بھی بہت ضروری ہے کیونکہ اس دور میں جب خیال و فکر کو درپا برد کر کے سارا فن سمجھ لیا گیا تھا، قمر رئیس نے اپنی نظموں میں فن اور مواد کا نہایت دلکش امتزاج پیش کر کے اس سیلاب کو موڑنے اور روکنے میں اہم رول ادا کیا۔

عابد سہیل، ۲/مارچ ۱۹۹۷ء (لکھنؤ)

❑❑❑

'نیا دور' اگست ۲۰۱۷ء کے شمارے کی ایک جھلک

ہندوستان کے ۶۴ ویں یوم آزادی کے موقع پر اہم تخلیقات

ہندوستان میں آزادئ نسواں کی علمبردار اور مقبول افسانہ نگار عصمت چغتائی کے ۱۰۲ ویں یوم ولادت کے موقع پر خصوصی گوشہ

عہد ساز افسانہ نگار پدم شری **قاضی عبدالستار** اور معروف نقاد **پروفیسر شمیم حنفی** سے

عصمت چغتائی کے فن اور شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر گفتگو

عصمت چغتائی جب بھی لکھنؤ آتی تھیں، ان کی مہمان نوازی کا کوئی بھی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتی تھیں **ڈاکٹر صبیحہ انور**

ان ملاقاتوں اور یادوں کی تفصیل نادر تصاویر کے ساتھ

عصمت چغتائی کی ناول اور افسانوں کی زبان پر **صفدر امام قادری** کا مضمون

رتن سنگھ کی نظمیہ کہانی، **تبسم فاطمہ** اور **نفیس انصاری** کے افسانے

طارق قمر کی نظم، مراٹھی ناول ایندھن کی چوتھی قسط، فرنچ افسانہ نگار کی کہانی اور دیگر تخلیقات

قمر رئیس، فن کے آئینے میں

نفیس عبدالحکیم
ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، الٰہ آباد یونیورسٹی
موبائل: 9415846066

آپ کا نام مصاحب علی خاں والد کا نام عبدالعلی خاں اور قلمی نام قمر رئیس ہے۔ اتر پردیش کے مشہور شہر شاہجہانپور میں پیدا ہوئے۔ انٹرمیڈیٹ تک کی تعلیم اپنے آبائی شہر شاہجہانپور میں حاصل کی۔ ۱۹۵۲ء میں آگرہ یونیورسٹی سے بی اے کیا اور ۱۹۵۳ء میں لکھنؤ یونیورسٹی سے اپنے والد کی ہدایت پر ایل ایل بی کی ڈگری حاصل کی۔ اس کے بعد ایم اے میں داخلہ بھی لیا لیکن ان کے والد محترم خود ایک کامیاب وکیل تھے اور ان کی خواہش تھی کہ قمر صاحب بھی اسی پیشہ کو اختیار کریں۔ چنانچہ قمر صاحب نے بھی ڈیڑھ دو سال پریکٹس کرنے کے بعد اس پیشہ کو چھوڑ دیا اور چھوڑنے کی وجہ قمر رئیس صاحب خود ایک انٹرویو میں کہتے ہیں:

''میری باطنی خدوں میں اس پیشہ سے ٹکراؤ ہے مثلاً یہ کہ رشوت دینا، جھوٹ کو صحیح، صحیح کو جھوٹ بنانا۔''

۱۹۵۵ء میں ناگپور یونیورسٹی سے ایم اے کیا اور ۱۹۵۸ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے پروفیسر رشید احمد صدیقی کی زیر نگرانی بعنوان 'پریم چند کا تنقیدی مطالعہ بحیثیت ناول نگار' ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ یہیں سے ان کی علمی، تدریسی اور تنقید نگاری کا ایک نیا باب شروع ہوتا ہے اور ایک لمبے عرصہ تک علم و ادب کی خدمت کرتے کرتے ۲۹/اپریل ۲۰۰۹ کو اس دارِفانی سے کوچ کر گئے۔

قمر رئیس بنیادی طور پر ترقی پسند ادیبوں میں سے تھے۔ ان کا تنقیدی نظریہ بھی ترقی پسندانہ تھا اور تحریک کے زوال کے باوجود انہوں نے کسی دوسری فکر اور نظریہ سے سمجھوتہ نہیں کیا اور پوری مستقل مزاجی کے ساتھ اس پر قائم رہے لیکن اس کے باوجود ان کے یہاں انتہا پسندی نہیں ہے بلکہ اعتدال و توازن ہے۔ وہ ہمیشہ ترقی پسند ادبی تحریک و نظریات ہی کی کسوٹی پر ادب کو پرکھتے تھے جیسا کہ ان کی تحریر و تقریر سے ثابت ہوتا ہے۔ اپنی کتاب 'تلاش و توازن' میں لکھتے ہیں:

''شاید اب اس حقیقت پر زور دینے کی ضرورت نہیں کہ ادب سماجی حقیقت کے اظہار کا ذریعہ ہے۔ ادب کی تخلیق ایک سماجی فعل ہے اس لئے ادب کے سماجی رویہ، گرد و پیش سے اس کے رشتوں اور اس کے زاویۂ نگاہ کی پرکھ میرے نزدیک تنقید کا ایک اہم فریضہ ہے۔''

> ۱۹۸۱-۸۲ء میں قرۃ العین حیدر بحیثیت وزیٹنگ پروفیسر علی گڑھ میں تھیں اور بات نکل گئی کہ اردو افسانہ نگاری میں پریم چند اور سجاد حیدر یلدرم میں سے کس کا زمانہ مقدم ہے اور پریم چند نے کہیں لکھ رکھا تھا کہ میرا پہلا افسانہ 'دنیا کا سب سے انمول رتن' ۱۹۰۷ء میں شائع ہوا۔ قمر رئیس صاحب نے جب پریم چند کی افسانہ نگاری کے آغاز کا سراغ لگانا شروع کیا تو اردو کے عام نقادوں اور محققوں کی طرح صرف سنی سنائی یا پریم چند کے اپنے بیان کو کافی نہیں سمجھا اور 'زمانہ' کانپور کے ۱۹۰۷ء کے سارے شمارے دیکھ ڈالے مگر ان میں کہیں بھی پریم چند کا کوئی افسانہ نہ ملا۔
>
> انہوں نے ۱۹۰۸ء کے شماروں میں تلاش کیا تو معلوم ہوا کہ یہ افسانہ 'دنیا کا سب سے انمول رتن' 'زمانہ' کے اپریل ۱۹۰۸ء کے شمارے میں ہے۔

بعض نقاد جب کسی فن پارے کا مطالعہ کرتے ہیں تو صرف رائے دیتے ہیں اور ایسی رائے جو بغیر تجربہ کے ہوتی ہے بلکہ نقادوں کو اپنی رائے پیش کرتے وقت یہ باور کرانا چاہئے کہ اس مخصوص فن پارے میں کیا ہے۔ جب نقاد خوب اچھی طرح یہ بتائے گا تب ہم خود بخود یہ سمجھ جائیں گے کہ اس میں کیا نہیں ہے جیسا کہ اطہر پرویز اپنی کتاب 'ادب کا مطالعہ' میں لکھتے ہیں:

''اکثر نقاد 'کیا ہے' کے بجائے 'کیا نہیں' پر زور دیتے ہیں اور پھر ان کی تان اس بات پر ٹوٹتی ہے کہ 'کیا ہونا چاہئے' گویا بحث کا موضوع وہ ہے جو اس فن پارے میں نہیں ہے لیکن پروفیسر قمر رئیس اس طرح کی تنقید نگاری سے مبرا ہیں۔ چنانچہ شفق کے افسانہ 'بادل' پر اپنی رائے کا اظہار کچھ یوں کرتے ہیں: 'کہانی کے اس مرحلے تک پہنچتے پہنچتے ایک باشعور قاری بجا طور پر سوچنے لگتا ہے کہ کہانی کی یہ استعاراتی فضا آخر کن سچائیوں، کن حقیقتوں کا اشاریہ ہے؟ وہ بڑی دلچسپی اور غیر شعوری انہماک سے کہانی کے دہشت آفریں لفظی پیکروں میں رشتہ تلاش کرتا اور ان کی پنہاں معنویت کو سمجھنے کی سعی کرتا ہے۔''

(نیا اردو افسانہ)

اسی میں آگے مزید لکھتے ہیں:

''اس بیانیہ میں جو تفصیلات ہیں وہ بکھراؤ اور بے جہتی کو جنم دیتی ہیں اور جس تاثر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ یہاں تحلیل ہونے لگتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ افسانہ نگار نے بالارادہ ان متضاد کیفیتوں اور بکھراؤ کے ماحول سے جوہری جنگ کے فوری نتیجے کی جھلک دکھانی چاہی ہو لیکن اس طرح تو اس سے قبل کا منظر جو زیادہ تاثر آفریں ہے بے معنی ہو جاتا ہے اور میرے نزدیک یہ افسانہ کے فنی تقاضوں سے میل نہیں کھاتا۔''

(نیا اردو افسانہ)

پروفیسر قمر رئیس نے اردو فکشن کو اپنی تنقید کا محور بنایا جب تنقید کے معنی محض شعری تنقید کے تھے۔ ابتدا ہی سے ناول، افسانہ اور خاص طور سے پریم چند کے مطالعہ میں مصروف رہے۔ افسانوی ادب سے اپنی خصوصی دلچسپی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''فکشن میرے مطالعہ کا خاص موضوع رہا ہے۔ اس کا آغاز اس وقت ہوا جب ۱۹۵۶ء میں وکالت کے آبائی پیشہ کو خیر باد کہہ کر ایک بار پھر میں طالب علم بن گیا اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں پریم چند کی ناول نگاری پر کام شروع کیا۔''

قمر رئیس نے پریم چند کے حالات زندگی، ان کی شخصیت، ان کی ناولوں اور افسانوں کے پس منظر اور ان کے فن کے مختلف پہلوؤں کا کئی زاویہ سے تجزیہ کیا ہے۔ پریم چند ان کے نزدیک قابل توجہ اس لئے ہے کہ پریم چند عام انسان تھے۔ ان کی زندگی کا بڑا حصہ دیہات میں گزرا اور دیہی زندگی کے مسائل کو اپنے فن کا موضوع بنایا اور ان کی پریشانیوں اور تہذیبوں کو اپنے افسانوں میں جگہ دی۔ ہندوستان کی حقیقی زندگی کو جاننے کا ایک بڑا ذریعہ ان کے ناول اور افسانے ہیں۔ پریم چند اور ان کے فن پر ان کی کئی کتابیں منظر عام پر آئیں۔ مثلاً پریم چند کے ناولوں کا تنقیدی مطالعہ، پریم چند فکر و فن، پریم چند شخصیت اور کارنامے اور مضامین پریم چند وغیرہ۔

پروفیسر قمر رئیس ایک ناقد کے ساتھ ساتھ ایک محقق بھی ہیں۔ وہ صرف زبانی یا سنی سنائی باتوں پر یقین نہیں کرتے بلکہ جب کوئی معاملہ یا واقعہ پیش آتا ہے تو اس کی تلاش و جستجو میں دن رات ایک کر دیتے

قمر رئیس نے پریم چند کے حالات زندگی، ان کی شخصیت، ان کی ناولوں اور افسانوں کے پس منظر اور ان کے فن کے مختلف پہلوؤں کا کئی زاویہ سے تجزیہ کیا ہے۔ پریم چند ان کے نزدیک قابل توجہ اس لئے ہے کہ پریم چند عام انسان تھے۔ ان کی زندگی کا بڑا حصہ دیہات میں گزرا اور دیہی زندگی کے مسائل کو اپنے فن کا موضوع بنایا اور ان کی پریشانیوں اور تہذیبوں کو اپنے افسانوں میں جگہ دی۔ ہندوستان کی حقیقی زندگی کو جاننے کا ایک بڑا ذریعہ ان کے ناول اور افسانے ہیں۔

پریم چند اور ان کے فن پر ان کی کئی کتابیں منظر عام پر آئیں۔ مثلاً پریم چند کے ناولوں کا تنقیدی مطالعہ، پریم چند فکر و فن، پریم چند شخصیت اور کارنامے اور مضامین پریم چند وغیرہ۔

پروفیسر قمر رئیس ایک ناقد کے ساتھ ساتھ ایک محقق بھی ہیں۔ وہ صرف زبانی یا سنی سنائی باتوں پر یقین نہیں کرتے بلکہ جب کوئی معاملہ یا واقعہ پیش آتا ہے تو اس کی تلاش و جستجو میں دن رات ایک کر دیتے ہیں اور تحقیق کا ایک واقعہ پروفیسر ابوالکلام قاسمی ایوان اردو کے ستمبر ۲۰۰۹ء کے شمارہ میں بیان کرتے ہیں:

۸۲-۱۹۸۱ء میں قرۃ العین حیدر بحیثیت وزیٹنگ پروفیسر علی گڑھ میں تھیں اور بات نکل گئی کہ اردو افسانہ نگاری میں پریم چند اور سجاد حیدر یلدرم میں سے کس کا زمانہ مقدم ہے اور پریم چند نے کہیں لکھ رکھا تھا کہ میرا پہلا افسانہ 'دنیا کا سب سے انمول رتن' ۱۹۰۷ء میں شائع ہوا۔ قمر رئیس صاحب نے جب پریم چند کی افسانہ نگاری کے آغاز کا سراغ لگانا شروع کیا تو اردو کے عام نقادوں اور محققوں کی طرح صرف سنی سنائی یا پریم چند کے اپنے بیان کو کافی نہیں سمجھا اور 'زمانہ' کانپور کے ۱۹۰۷ء کے سارے شمارے دیکھ ڈالے مگر ان میں کہیں بھی پریم چند کا کوئی افسانہ نہ ملا۔ انہوں نے ۱۹۰۸ء کے شماروں میں تلاش کیا تو معلوم ہوا کہ یہ افسانہ 'دنیا کا سب سے انمول رتن' 'زمانہ' کے اپریل ۱۹۰۸ء کے شمارے میں ہے۔

قمر رئیس ایک نقاد، مترجم، صحافی، ماہر پریم چند اور ترقی پسند تحریک کے روح رواں ہونے کے ساتھ ایک شاعر کی حیثیت سے بھی ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ان کے شاعر ہونے اور قلمی نام کا واقعہ بھی بڑا دلچسپ اور سچی محبت سے بھرپور ترجمان ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ قمر نامی ایک نازنین کے زلف و رخسار کے گرفتار ہو گئے اور اپنی اسی محبوبہ کے نام پر قمر نعمانی کے نام سے شاعری کا آغاز کیا لیکن زمانہ کے حالات نے ساتھ نہیں دیا اور عشق میں ناکام ہو جانے کے بعد ان کی شادی رسم و رواج کے مطابق شہر کی ایک خاتون رئیس بانو سے ہوئی اور وہ اپنی اس شریک حیات سے بے پناہ محبت کرتے تھے اور اپنی بیوی کے نام کو بھی اپنے قلمی نام میں سمو لیا اور قمر نعمانی سے قمر رئیس ہو گئے۔

ان کی شاعری، خود اعتمادی خوبصورت مناظر اور موضوعاتی تنوع سے بھرپور ہے۔ ان کا شعری مجموعہ 'شام نوروز' ۲۰۰۵ء میں شائع ہوا۔ یہ ان کا شعری سرمایہ طویل و مختصر نظموں کے علاوہ منفرد لب و لہجہ رکھنے والی غزلوں پر مشتمل ہے۔ ان کی نظمیں موضوعاتی تنوع، ربط و تسلسل، تجربہ، مشاہدہ اور گزرے ہوئے لمحات کا ایک بحر بیکراں ہے جیسا کہ انہوں نے 'شام نوروز' میں لکھا ہے:

''یہ مجھے تجربہ نے سکھایا کہ شعری وجدان

کا سب سے وسیع، معتبر، متنوع اور جمال آفریں سرچشمہ بچپن اور لڑکپن کے تجربوں، مشاہدوں اور یادوں کا انمول ذخیرہ ہوتا ہے۔ وہ تحت الشعور کی محفوظ پناہ گاہوں میں رہ کر بڑے پراسرار ڈھنگ سے عمل کرتا ہے۔''

ان کی مشہور نظم 'اے وطن نقرئی یادوں کے چمن' جس میں دنیا کے مختلف ممالک اور ان کی تہذیب و ثقافت کا ذکر ہے۔ جس طرح ایک مکین کو اپنے مکان سے، آبائی وطن سے محبت ہوتی ہے۔ اسی طرح قمر رئیس کو اپنے وطن اور شہر میں گزارے ہوئے بچپن کے نہ بھولنے والے واقعات سے محبت ہے جس کا ذکر انہوں نے اس نظم میں کیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

اے وطن
نقرئی یادوں کے چمن
سچ ہے میں نصف صدی سے ہوں
تیری گود سے دور
کیا بتاؤں کتنا رہا مجبور
ہاں میں آوارہ رہا
تو مگر شوق کا گھوارہ رہا
تیرے ذرات کی تابش کا یہ افسوں تھا کہ میں
جن دیاروں میں رہا
مثل سیارہ رہا
اپنے ہی نافہ کی خوشبو سے رہا دیوانہ
اپنی ہی شمع شبستاں کا رہا پروانہ

اسی طرح اس نظم میں آگے کہتے ہیں:

پچھمی دیس کے شہروں میں بھٹکتا ہوا میں
جب کسی شوخ کے کاشانے میں سوجاتا تھا
نیلی آنکھوں کی حسیں جھیل میں کھو جاتا تھا
خواب میں تیرے حسیناؤں کو میں پاتا تھا
ان کے سنولائے بدن کجرا لگی آنکھوں سے
مئے جو رہ رہ کے چھلکتی تھی
وہ پی جاتا تھا

قمر رئیس کے اندر صرف تحریری اور تقریری صلاحیتیں نہ تھیں بلکہ وہ اپنے اندر ایک تنظیمی صلاحیت بھی رکھتے تھے۔ چنانچہ سجاد ظہیر کے بعد جب انجمن ترقی پسند مصنفین کی باگ ڈور آپ کے ہاتھوں میں آئی اور ۱۹۸۰ء میں انجمن کے باقاعدہ سکریٹری چنے گئے تو انہوں نے بڑی حسن وخوبی اور عدل و انصاف کے ساتھ تاحیات اس ذمہ داری کو نبھایا اور اپنے منصب کا کبھی غلط استعمال نہیں کیا جیسا کہ پروفیسر علی احمد فاطمی لکھتے ہیں:

''وہ بھرپور ترقی پسند تھے اور ترقی پسند ادب اور ترقی پسند ادیبوں کی حمایت ضرور کرتے تھے لیکن انہیں کی حمایت کرتے تھے جو اس کے حقدار ہوتے۔ دہلی اردو اکادمی کے بڑے انعامات انہیں ترقی پسند ادیبوں کو دئے اور دلوائے جو واقعی حقدار تھے۔''

قمر رئیس کے اندر صرف تحریری اور تقریری صلاحیتیں نہ تھیں بلکہ وہ اپنے اندر ایک تنظیمی صلاحیت بھی رکھتے تھے۔ چنانچہ سجاد ظہیر کے بعد جب انجمن ترقی پسند مصنفین کی باگ ڈور آپ کے ہاتھوں میں آئی اور ۱۹۸۰ء میں انجمن کے باقاعدہ سکریٹری چنے گئے تو انہوں نے بڑی حسن وخوبی اور عدل وانصاف کے ساتھ تاحیات اس ذمہ داری کو نبھایا اور اپنے منصب کا کبھی غلط استعمال نہیں کیا جیسا کہ پروفیسر علی احمد فاطمی لکھتے ہیں:

''وہ بھرپور ترقی پسند تھے اور ترقی پسند ادب اور ترقی پسند ادیبوں کی حمایت ضرور کرتے تھے لیکن انہیں کی حمایت کرتے تھے جو اس کے حقدار ہوتے۔ دہلی اردو اکادمی کے بڑے انعامات انہیں ترقی پسند ادیبوں کو دئے اور دلوائے جو واقعی حقدار تھے۔''

دہلی اردو اکادمی کے وائس چیئر مین کی حیثیت سے بھی انہوں نے اپنی تنظیمی ذمہ داریوں کا بہترین نمونہ پیش کیا اور اس عہدے پر رہتے ہوئے مختلف ادبی موضوعات پر مختلف سیمینار اور دیگر پروگرام منعقد کرا کر اکادمی کے ادبی، علمی و تہذیبی سرگرمیوں سے لوگوں کو روشناس کرایا۔

ان کی گرانمایہ اور قابل قدر تصنیفات اور ادبی خدمات پر مختلف اکادمیوں اور ادبی اداروں نے مختلف اعزازات وانعامات سے نوازا۔ ان میں سے بعض اہم کا تذکرہ کیا جارہا ہے:

۱۹۶۰ء میں اعلیٰ میرٹ ایوارڈ، اتر پردیش حکومت برائے پریم چند کا تنقیدی مطالعہ، ۱۹۶۸ء میں اتر پردیش اردو اکادمی ایوارڈ برائے تنقیدی تناظر، امتیاز میر ایوارڈ میرا کادمی لکھنؤ برائے تنقید۔ ۱۹۸۱ء میں بہار اردو اکادمی ایوارڈ برائے پریم چند فکر وفن، ۱۹۸۴ء میں ہندی اردو ادب ایوارڈ، ہندی اردو ساہتیہ کمیٹی، لکھنؤ، ۱۹۸۶ء میں نیشنل لکچرر (اعزاز) یونیورسٹی گرانٹس کمیشن، نئی دہلی، ۱۹۸۷ء میں سید احتشام حسین میموریل ایوارڈ برائے تنقید، ۱۹۸۹ء میں پریم چند ایوارڈ، انڈین کلچر سوسائٹی، نئی دہلی، ۱۹۸۹ء میں نیاز فتح پوری ادبی ایوارڈ، بزم نیاز کراچی، ۱۹۹۴ء میں بھارتیہ انوواد پریشد ایوارڈ برائے ترجمہ، ۱۹۹۵ء میں مولانا ابوالکلام آزاد ایوارڈ اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ، ۲۰۰۱ء میں غالب ایوارڈ، غالب انسٹیٹیوٹ، نئی دہلی برائے اردو نثر، ۲۰۰۲ء میں اردو اکادمی دہلی ایوارڈ برائے تنقید وتحقیق، ۲۰۰۴ء میں ظہیر الدین بابر ایوارڈ، انٹرنیشنل فاؤنڈیشن تاشقند براء مطالعہ بابر اور کل ہند پرویز شاہدی ایوارڈ، اردو اکیڈمی مغربی بنگال وغیرہ۔

❑❑❑

غزل

تم اپنا پہلا قدم تو اٹھاؤ بسم اللہ
خدا سنبھالنے والا ہے جاؤ بسم اللہ

مرے نصیب میں لکھ ہی دیا ہے زہر کا جام
تو اے زمیں کے خداؤں بڑھاؤ بسم اللہ

وہ کیا تھا جس میں محبت کی جیت ہوتی تھی
سناؤ پھر وہی قصہ سناؤ بسم اللہ

تمہیں پسند نہیں یہ جہاں تو چھوڑو اسے
بناؤ اک نئی دنیا بناؤ بسم اللہ

اگر یہ جنگ ہے تو مجھ سے ہار جاؤ گے
اگر یہ عشق ہے تو پاس آؤ بسم اللہ

نعمان شوق
اے ۵۰۱، پراسر کنج، سیکٹر پی ون، گریٹر نوئیڈا
موبائل: 9810571659

غزل

نہ وہ انجم ہے نہ وہ شمس و قمر جیسا ہے
آسماں اس کے لئے راہ گزر جیسا ہے

چور ہو جائے گا ہر قطرۂ شبنم کا غرور
چند لمحوں کے لئے جو کہ گہر جیسا ہے

اب نگاہیں مری رکتی نہیں اس کے رُخ پر
میرے محبوب کا ہر عکس بھنور جیسا ہے

تو کرم کر دے تو ہو جائے گل تر جیسا
دل کا ہر زخم مرے دوست شرر جیسا ہے

قیس رہتا ہے یہیں ہیر بھی لیلیٰ بھی یہیں
دل مرا ایک محبت کے نگر جیسا ہے

اس سلیقے سے وہ چلتا ہے کہ ٹھوکر نہ لگے
ہے تو نابینا مگر اہل نظر جیسا ہے

اب سبھی امن کی کرتے ہیں دعائیں خوشترؔ
یعنی احساس اُدھر کا بھی اِدھر جیسا ہے

خوشترؔ رحمانی
۲۷۱، مردہی ٹولہ، سیتاپور
موبائل: 9455217290

اُن کی واپسی

زیب اختر
فلیٹ نمبر ۳د، لکشمی ساوتری اپارٹمنٹ، بنسی چوک، رانچی
موبائل: 9199443360

پڑھا تھا اور کئی بار بڑے بوڑھوں سے سنا بھی تھا کہ 'صبر کرنے والوں کے ساتھ اللہ خود ہے' اس کے گھر دیر ہے اندھیر نہیں۔ آج اس کے قائل ہم بھی ہو گئے تھے۔ جب ڈاکٹر صاحب نے بڑی دیر تک دادی کی نبض ٹٹولنے کے بعد اور گلے میں لٹکے آلے سے ان کی دھڑکنوں کو گننے کے بعد بتایا کہ اب یہ رکیں گی نہیں، بس کل صبح یا شام تک۔

ابو اور منجھلے چاچا بھی اس وقت وہیں پر تھے۔ دونوں کے چہرے پر اداسی تھی۔ ڈاکٹر کی بات سن کر ابو تو بالکل خاموش ہو گئے تھے۔ منجھلے چاچا نے پھر بھی کہا، ڈاکٹر صاحب! اس بات کا اندازہ تو ہم لوگوں کو بھی تھا مگر تب تک ان کی سانس آسانی سے چلتی رہے، اسی کے لئے ہم نے آپ کو بلایا تھا۔

ڈاکٹر صاحب نے سلائن کی بوتل بدلتے ہوئے کہا، نہیں! اب آکسیجن وغیرہ بھی دینے کی ضرورت نہیں ویسے میں نے 'کورامن' کا انجکشن دے دیا ہے۔

یہ سب سن کر ہم دونوں بھائیوں کی خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا۔ ہم لوگوں نے صبر کیا تھا۔ اس کا پھل تو ہمیں ملنا ہی تھا یعنی دیر اب بالکل نہیں تھی بس کل صبح یا شام تک کا اندھیرا تھا۔ پچھلے دو مہینے سے ہم اسی کے انتظار میں تھے، جب سے دادی بیمار پڑی تھیں۔ دیوار یا کسی آدمی کا سہارا لے کر وہ چل تو سکتی تھیں لیکن چاول یا روٹی کھانا انہوں نے بند سا کر دیا تھا۔ دوسرے مہینے وہ اتنی کمزور ہو گئیں تھیں کہ بستر سے اٹھ بھی نہیں سکتی تھیں، پورے دن لیٹی رہتی تھیں۔ دوائیاں اور پھلوں کے رس ہی اب پی سکتی تھیں، پھر وہ لوگوں کو پہچاننے سے بھی منع کرنے لگیں۔ دھیرے دھیرے ان کی دیکھنے اور سننے کی طاقت بھی ختم سی ہو گئی۔ ان کے پاس کچھ بولنا ہوتا تو پہلے کان کے پاس منھ لے جا کر زور زور سے اپنا نام بتانا پڑتا۔ جواب میں وہ گھسٹتی رِریاتی

پچھلے دو مہینوں کی ایک ایک دن کی بات کیونکہ ان سب کے ساتھ ہمارے صبر کا بھی تو امتحان ہو رہا تھا اور کوئی نہیں جانتا تھا کہ دادی کی حالت دیکھ کر ہم نے بھی آنسو بہائے تھے۔ ہاں، یہ سب مجھے یاد تھا مگر آج ڈاکٹر صاحب کی باتوں نے ان غمزدہ یادوں پر خوشی کی جلد چڑھا دی تھی اور اس وقت ہم تمام پچھلی باتیں بھول کر خوشی سے چلا دینا چاہتے تھے۔ من ہوا کہ دوڑتے ہوئے جائیں اور سبھی دوستوں کو یہ خوش خبری سنا دیں لیکن گھر کے سبھی لوگ ڈاکٹر صاحب کے چلے جانے کے بعد جس طرح سے چپ تھے، اسے دیکھ کر ہم ہل بھی نہ سکے۔ دادی کی چارپائی کے پاس کھڑے پل پل بدلتے ان کے چہرے کو دیکھتے رہے۔ سلائن کی بوتل سے بوند بوند پانی ٹپک کر ان کے جسم میں پہنچ رہا تھا۔ کچھ دیر رک رک کر ان کے گلے سے آہ آہ کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

آواز میں پتہ نہیں کیا بولتی، امی اور ابو بھی سمجھ نہ پاتے۔ دادی کو جب اپنی لاچاری کا احساس ہوتا تو وہ بولنا بند کر پاس بیٹھے ابو یا امی ہمارے سر پر ہاتھ رکھ کر ٹٹولنے جیسا سہلانے لگتیں۔ امی کبھی کبھی ان کو دوائی پلاتے ہوئے سسکنے لگتیں اور کہتیں، جانے انجانے میں ہم لوگوں سے جو غلطی ہوئی اسے معاف کرتی جانا اماں۔

ابو شاید ان سب سے اکتاتے تھے۔ وہ دادی کے کمرے میں کم جاتے لیکن امی کے کہنے پر وہ ایک دن دادی کے کمرے میں گئے اور بولے، اپنے بیٹوں کا دودھ بخش دو ماں، اس قرض سے ہم سب بھائیوں کو چھٹکارا دے دو۔

نہ جانے امی کن غلطیوں کی معافی چاہتی تھیں اور ابو کس قرض سے ان سے چکتا کرنے کے لئے کہتے۔ ہماری سمجھ میں کچھ بھی نہ آتا۔

جب حالت اور خراب ہو گئی تو ابو نے دونوں چاچا کو بلوا لیا۔ پڑوس کے ارمان بھائی گئے تھے منجھلے چاچا کو لانے۔ چھوٹے چاچا کو ٹیلی گرام سے خبر کر دی گئی تھی۔ یہ سب کچھ مجھے یاد تھا۔

پچھلے دو مہینوں کی ایک ایک دن کی بات کیونکہ ان سب کے ساتھ ہمارے صبر کا بھی تو امتحان ہو رہا تھا اور کوئی نہیں جانتا تھا کہ دادی کی حالت دیکھ کر ہم نے بھی آنسو بہائے تھے۔ ہاں، یہ سب مجھے یاد تھا مگر آج ڈاکٹر صاحب کی باتوں نے ان غمزدہ یادوں پر خوشی کی جلد چڑھا دی تھی اور اس وقت ہم تمام پچھلی باتیں بھول کر خوشی سے چلا دینا چاہتے تھے۔ من ہوا کہ دوڑتے ہوئے جائیں اور سبھی دوستوں کو یہ خوش خبری سنا دیں لیکن گھر کے سبھی لوگ ڈاکٹر صاحب کے چلے جانے کے بعد جس طرح سے چپ تھے، اسے دیکھ کر ہم ہل بھی نہ سکے۔ دادی کی چارپائی کے پاس کھڑے پل پل بدلتے ان کے چہرے کو دیکھتے رہے۔ سلائن کی بوتل سے بوند بوند پانی ٹپک کر ان کے جسم میں پہنچ رہا

تھا۔ کچھ دیر رک رک کر ان کے گلے سے آہ آہ کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ لوگ ان کے اردگرد اس طرح جمع تھے جیسے دادی ابھی ابھی کوئی کرشمہ دکھانے والی ہوں۔

میں نے اپنے چھوٹے چاچا کے لڑکے مولا کی طرف دیکھا جو مجھ سے چھوٹا تھا۔ وہ چھوٹی چاچی کی گود سے چپکا ہوا تھا، مجھے کھا جانے والی نظروں سے گھور رہا تھا۔ دراصل صبح ہم لوگوں نے اسے کھیل کے دوران بری طرح سے پیٹ دیا تھا۔ وہ تبھی سے بدکا ہوا تھا۔ چپکا ہوا کیا تھا، بلکہ چھوٹی چاچی کو اس نے جکڑ رکھا تھا۔ اتنا بڑا لڑکا اور اتنا ڈرپوک۔ ہم لوگوں کو ہنسی آتی تھی۔ یہ بھی کوئی عمر ہے گود میں کھیلنے کی۔ ارے کمبخت مجھے دیکھو، میرے چھوٹے بھائی جنید کو دیکھو، تم سے سال بھر ہی تو بڑا ہوگا لیکن ہر گھڑی پیٹنے پٹانے پر اتارو رہتا ہے۔ دیکھا ہے کبھی امی کی گود میں ہمیں پناہ لیتے ہوئے؟ اب یہ بات الگ تھی کہ ایسے وقت میں امی اور ابو کے ہاتھوں ہم لوگ دوبارہ پیٹے جاتے کہ تم نے جھگڑا ہی کیوں کیا اور ایک یہ صاحب ہیں کہ کچھ بھی ہوا تو ماں۔۔۔۔ ماں بکری کی طرح ممیاتے ہوئے چڑھ گئے ماں کی گود میں، بزدل کہیں کا! اگر ہماری طرح شہر کے کسی بڑے اسکول میں پڑھتا تو پیشاب اتر آتا بچو کا، چھٹی کے وقت ڈھیر سارے لڑکوں کا شور سن کر۔

گود میں بھی کیسے رہتا ہے، دیکھو! مجھے اور بھی ہنسی آتی، دونوں ٹانگیں ماں کے پیٹ سے لپٹا لیتا، باہوں کا ہار ان کی گردن میں ڈال کر سینے پر سر رکھ دیتا، وہ ہوتی ہے نا، کھجور کے پیڑ سے لپٹی ہوئی مٹی کی ہانڈی جس میں رِس رِس کر کھجور کا رس جمع ہوتا رہتا ہے، بالکل ویسا ہی لگتا وہ۔ چھوٹی چاچی لمبی اور دبلی پتلی تھی، وہ موٹا مسٹنڈا بھینس جیسا، اس تصور میں دو چار چاند اور لگ جاتے پھر نقشہ کچھ یوں بنتا۔ ایک پتلا سا بیحد گورا کھجور کا درخت اور اس کے اوپری چھور پر جھولتا ہوا ایک کالا اور بڑا سا ہانڈا۔ میں نے اسے زبان نکال کر چڑھایا تو اس نے دوسری طرف منھ پھیر لیا۔ میرے منھ سے نکلا، گدھا کہیں کا!

کچھ دیر بعد لوگ دادی کے کمرے سے ایک ایک کر کے جانے لگے۔ ابو اور منجھلے چاچا پہلے جا چکے تھے۔ منجھلی چاچی دادی کو چمچ سے سنترے کا جوس پلا رہی تھیں۔ امی وہیں بیٹھی تسبیح پڑھ رہی تھیں۔ چھوٹی چاچی کو انہوں نے اشارہ سے رسوئی میں جانے کے لئے کہا کیونکہ دوپہر کا وقت ہونے جا رہا تھا اور کھانا ابھی تک نہیں بنا تھا۔

ہم دونوں بھائی بھی چپ چاپ کمرے سے

کچھ دیر بعد لوگ دادی کے کمرے سے ایک ایک کر کے جانے لگے۔ ابو اور منجھلے چاچا پہلے جا چکے تھے۔ منجھلی چاچی دادی کو چمچ سے سنترے کا جوس پلا رہی تھیں۔ امی وہیں بیٹھی تسبیح پڑھ رہی تھیں۔ چھوٹی چاچی کو انہوں نے اشارہ سے رسوئی میں جانے کے لئے کہا کیونکہ دوپہر کا وقت ہونے جا رہا تھا اور کھانا ابھی تک نہیں بنا تھا۔ ہم دونوں بھائی بھی چپ چاپ کمرے سے نکل کر اسٹڈی روم میں آ گئے اور بستے میں چھپائے کچے نکال کر گننے لگے۔ تبھی مجھے علی اور وقار کی یاد آئی۔ عین ان کا اس وقت یاد آنا مجھے بڑا اچھا لگا۔ کیا بیتے گی علی پر جب اسے معلوم ہوگا کہ ہماری دادی گزر گئیں۔ بیچارہ جل کر رہ جائے گا۔ ویسے سر تان کر چلتا تھا ہمارے سامنے جیسے اللہ کبھی ہماری سنے گا ہی نہیں۔ دنیا بھر میں ایک بدنصیب ہم ہی ہیں۔ نہ ہمارا کوئی قبرستان میں دفن ہے اور نہ کوئی ٹیچر ہے ہمارے یہاں۔

نکل کر اسٹڈی روم میں آ گئے اور بستے میں چھپائے کچے نکال کر گننے لگے۔ تبھی مجھے علی اور وقار کی یاد آئی۔ عین ان کا اس وقت یاد آنا مجھے بڑا اچھا لگا۔ کیا بیتے گی علی پر جب اسے معلوم ہوگا کہ ہماری دادی گزر گئیں۔ بیچارہ جل کر رہ جائے گا۔ ویسے سر تان کر چلتا تھا ہمارے سامنے جیسے اللہ کبھی ہماری سنے گا ہی نہیں۔ دنیا بھر میں ایک بدنصیب ہم ہی ہیں۔ نہ ہمارا کوئی قبرستان میں دفن ہے اور نہ کوئی ٹیچر ہے ہمارے یہاں۔

سچ مانا جائے تو اس خوشی کا صلہ علی اور وقار ہی سے ہمیں ملا تھا۔ ان دونوں کی موت کی وجہ ہی سے دادی کی موت کے بارے میں ہم سوچنے لگے تھے کہ کب ایسا ہو اور ہمیں بھی ان کو نیچا دکھانے کا موقع ملے۔ آخر اتنے دنوں سے ہم بھی تو ان کے سامنے بھیگی بلی بن کر رہتے آئے تھے۔ اب پتہ چلے گا ان دونوں کو۔

وقار اور علی، دونوں ہمارے ساتھ ہی پڑھتے تھے۔ وقار کے ابو اسکول میں حساب کے ٹیچر تھے۔ جب ہم اسکول جاتے تو وقار ہمیں بڑے فخر سے بتایا، وہ دیکھو، ابو جا رہے ہیں یا ہمیں سمجھاتا، بڑے کڑک مزاج ہیں، ان کا ہوم ورک ذرا دھیان سے کرنا۔

ہم دونوں بھائی اس کے ابو کو بڑی حسرت سے دیکھتے۔ اس سے بھی زیادہ لالچ ہمیں وقار کو دیکھ کر آتا، اداسی چھا جاتی۔ ہمارے چہرے سوکھے ہوئے بھٹے کی طرح سخت اور سفید ہو جاتے۔ حالانکہ وہ پیدل ہی اسکول جاتا جب کہ ہم موٹر کار سے۔ پھر بھی ہم سوچتے، کاش ہمارے ابو بھی اسکول میں ٹیچر ہوتے۔ کلاس میں جب وہ لڑکوں کی پٹائی کرتے تو وقار کی طرح ہم بھی سبھی دوستوں کو دکھاتے اور آفس میں ویسے ہی پرسکون اور بے خوف ہو کر بیٹھ سکتے جیسے وقار بیٹھتا تھا۔ 'نو انٹری' کے بورڈ کو نظر انداز کرتے ہوئے۔ لاپروائی کے ساتھ، ڈیسٹر اور چاک سے کھیلتے ہوئے، اسکول کی ہر چیز اس کی ملکیت میں شامل تھی جیسے۔

اسی طرح کی جلن ہمیں علی سے بھی تھی۔ علی ہمارا پڑوسی تھا اور دوست بھی۔ ہم لوگوں سے وہ پڑھنے میں تیز تھا۔ ابو اسے بہت مان دیا کرتے تھے سو مرتے کیا نہ کرتے۔ باتیں تو ہنس کر کرتے لیکن بازی ہمیشہ اس سے مار لے جانے کی تاک میں رہتے پھر بھی مات ہر جگہ ہمیں ہی ملتی۔ وہ تیز ہونے کی وجہ سے کلاس میں نڈر، غراتے شیر کی طرح رہتا اور ہم دونوں بھائی ممیاتے مریل میمنوں کی طرح۔ دوسرے وہ ہماری ہی گاڑی میں اسکول آتا اور ابو سے باتیں کرتے ہوئے

ابو کے بغل میں بیٹھ کر آتا۔ ہم پیچھے 'دیش نکالے' کی طرح بیٹھے رہتے۔ گاڑی چلاتے ہوئے ابو اس کی پیٹھ پر اپنا بایاں ہاتھ ایسے پھیرتے جیسے اخبار پڑھتے وقت سیزر کتے کو سہلاتے تھے۔ ہم پچھلی سیٹ پر سے ان کے سروں کے پچھلے حصے کو تاکتے رہتے یا کھڑکی سے باہر ایسے دیکھتے جیسے باہر بہت تیز بارش ہو رہی ہو اور ہمیں اتر کر جانے کے لئے کہہ دیا گیا ہو۔ علی کے ابو اسکول میں ٹیچر نہیں تھے نہ ان کی آئس کریم کی دکان تھی جس کی وجہ سے ہم علی سے حسد رکھتے۔ بات یہ تھی کہ وہ مہینے کی چودھویں تاریخ کو قبرستان جاتا۔ چونکہ قبرستان کافی دور تھا اس لئے یہاں بھی ہماری ہی گاڑی استعمال میں لائی جاتی۔ اس دن وہ اپنے ابو کے ساتھ ہوتا۔ ہم دونوں ان دونوں کو دیکھتے۔ کس طرح وہ لوگ گاڑی میں بیٹھتے ہی اداس اور سنجیدہ ہو جاتے، راستے بھر چپ رہتے۔ ان کے ساتھ ابو پر بھی یہی کیفیت طاری ہو جاتی۔ علی بھی اتنا ہی سنجیدہ ہو جاتا۔ ایسا لگتا کہ وہ اپنی عمر کے پانچ چھ سال چھلانگ لگا کر اچانک بڑا ہو گیا ہے۔ آگے کی سیٹ پر بیٹھے بیٹھے یکا یک اس کا قد بڑا ہو جاتا اور ہم گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھے اور اکیلے، اور پیچھے اور چھوٹے ہو جاتے۔ پھر قبرستان آتا۔

چہار دیواری کے باہر بنے ہینڈ پمپ پر ہم سب وضو کرتے، اپنے جوتے جھاڑیوں کے بیچ چھپا کر رکھتے اور قبرستان میں سہمے سہمے داخل ہوتے۔ ابو ایک جگہ پر کھڑے ہو کر ہاتھ اوپر اٹھا کر کچھ بدبداتے۔ ہم دونوں علی کے ساتھ رہتے۔ علی کے ہاتھ میں اگربتی کے دو چار پیکٹ، ماچس اور گلاب جل کی ایک شیشی ہوتی۔ اس کے ابو ایک ایک کر کے تینوں کی قبر کے پاس جاتے اور ان سب کے لئے دعائیں پڑھتے اور علی بڑے احترام سے ان قبروں کے سرہانے اگربتی جلا کر مٹی میں گاڑ دیتا۔ گلاب کا پانی چھڑکتا اور کچھ پھول ان کے چہرے پر بکھیر دیتا۔ اس دوران ہمیں بھی بتاتا جاتا۔

''یہ ہماری پھوپھی کی قبر ہے، یہ میرے دور کے ماموں تھے اور یہ میرے دادا کے بھائی۔''

ہم ان سب کے پاس کچھ دیر کے لئے کھڑے ہو جاتے، ٹھگے سے اور بیحد بناوٹی اداسی لپیٹے۔ وہ اسی فخر کے ساتھ اپنا کام انجام دیتا رہتا۔ وہ ہماری طرف ایک بار بھی نہیں دیکھتا اور ہم تھے کہ مسلسل اسی کو نہارتے جاتے کہ وہ کب سب سے زیادہ اچھا لگتا ہے، دعائیں مانگتے، اگربتی جلاتے، خوشبو چھڑکتے یا قبروں پر پھول بکھیرتے۔

تو اس وقت علی کا یاد آنا بڑا سکون بخش لگا۔

گھر میں سارے لوگ جمع ہو گئے تھے۔ کچھ

دور کے اور کچھ بالکل قریبی رشتہ دار۔ اس سے پتہ چلتا تھا کہ دادی کا مرنا کوئی ایسا ویسا کام نہیں ہے۔ یہاں تو شادی بیاہ جیسی گہما گہمی تھی اور گھر میں کوئی بڑا کام ہوتا تو اکثر کسی نہ کسی بہانے ہماری پٹائی ضرور ہو جاتی کیونکہ ایسے موقعوں پر ابو اور امی کا پارا ہمیشہ چڑھا ہوا رہتا۔ بقول ابو، ہم اول درجے کے شیطان تھے۔ ہماری پیدائش شیطانوں کے سردار ابلیس کے یہاں ہونی چاہئے تھی۔ ہم غلطی سے اس اعلیٰ خاندان میں پیدا کر دئے گئے تھے سو ایسے موقع پر جب ہم لوگوں سے کوئی غلطی نہ ہو جائے اس کی فکر ہونے لگی۔ میں نے سوچا کیوں نہ علی سے چل کر مل لیا جائے اور اس سے موت کے آداب پوچھ لیں کہ ہمیں کیا کرنا چاہئے اور کیا نہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہمارے کسی کام سے اس نیک کام میں خلل پڑ جائے اور ہمیں پھر سے ان ہی محرومیوں کا شکار ہونا پڑے۔

علی کے گھر سے لوٹنے کے بعد ہم کافی محتاط ہو گئے۔ اس کی باتیں ہم دونوں بھائیوں نے غور سے سنی تھیں۔ ان ڈھیر ساری اور بڑی بڑی باتوں کو اپنے چھوٹے دماغ میں اچھی طرح سے اٹا لیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ہم دونوں بھائی اس وقت بھوکے ہونے کے باوجود سمجھدار اور سنجیدہ دکھائی دے رہے تھے۔

جب ہم گھر پہنچے تو بڑی زور سے ایک عورت کے رونے کی آواز آ رہی تھی۔ باقی سبھی عورتیں اسے عجیب عجیب ڈھنگ سے تسلی دے رہی تھیں۔ میں نے سوچا، دادی کہیں مر تو نہیں گئیں؟ میں فوراً دادی کے کمرے میں پہنچا، کسی سے پوچھنے کی جرأت مجھے نہیں ہوئی۔ میں نے دادی کے چہرے کو بہت غور سے دیکھا۔ سانس کے چلنے کا پتہ تو نہ چلتا تھا مگر آنکھوں کی پتلیوں کی حرکت سے آثار حیات ظاہر ہو رہے تھے یعنی دادی زندہ تھیں۔ تب وہ عورت ابھی کیوں رو رہی ہے؟ مجھے سمجھ میں نہ آیا۔ علی نے بتایا تھا کہ سب سے پہلے سانس رک جاتی ہے، کہیں سے حرکت نہیں ہوتی ہے اور جسم کا ہر حصہ ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ اتنے سے بھی اگر نہ پتہ چلے تو لوگوں کا رونا بلکنا دیکھ کر سمجھ لینا چاہئے کہ موت ہو چکی ہے۔

پھر کسی نے بتایا کہ رونے والی خاتون دادی کی چھوٹی بہن تھیں اور ابھی ابھی یہاں پہنچی تھیں۔ آج پورے بیس برس کے بعد وہ اپنی بہن سے مل رہی تھیں اس حالت میں۔ خیر، جب ہم نے یقین کر لیا کہ دادی زندہ ہیں تب ہم رسوئی کی طرف بڑھے۔

وہاں چھوٹی چاچی اکیلی اپنے کام میں مصروف تھیں۔ ایک بڑی سی پلیٹ میں ڈھیر ساری روٹیاں،

ایک بڑی دیگچی میں خوشبودار سالن والی سبزی۔ وہ سلاد کاٹ رہی تھیں۔ اتنے سارے لوگوں کا کھانا میں ایک ساتھ گھر میں پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ گھر کی دونوں نوکرانیاں ہفتے بھر سے غائب تھیں۔ ایک کے گھر میں شادی تھی اور ایک کی ساس بیمار تھی۔ امی کو جب یہ خبر ملی تو وہ بہت پریشان ہوگئی تھیں۔ انہوں نے ابو سے کہا تھا، اتنے سارے کام اور میں اکیلی جان! کیسے ہو سکے اتنا سب؟ مگر یہ اتفاق کہ چھوٹی چاچی اسی دن گھر پہنچ گئی تھیں اور مسئلہ حل ہوگیا۔ انہوں نے آتے ہی چوکا سنبھال لیا اور تب سے میں انہیں رسوئی گھر میں ہی دیکھتا آ رہا تھا۔ دادی کے کمرے یا ادھر ادھر بہت کم۔

پسینے سے سرابور ان کا چہرا، میلی سی ساڑی میں ہمیشہ ان کا خاموش رہنا، ان کا پروسا کھانا، کبھی کبھی بڑا عجیب لگتا، اس کی وجہ شاید اجنبی پن تھا۔ گھر میں منجھلی چاچی بھی موجود تھیں۔ دو ایک سال میں ہمارے یہاں آتی رہتی تھیں۔ ہم دونوں بھائی ان سے ذرا بھی نہیں شرماتے تھے، کبھی کبھار وہ ہمیں ڈانٹ بھی دیتی تھیں۔ ہم ان سے پیسے لینے میں بھی نہیں ہچکتے تھے اور چھوٹی چاچی۔

ان کا بیٹا مولا جب ہم سے تنگ آ کر روتا ہوا ان کے پاس پہنچتا تب بھی وہ ہم لوگوں کو کچھ نہیں کہتی تھیں۔ ہم ڈرتے لیکن وہ پھر بھی اسی شفقت و محبت سے کھانا پروستیں۔

چھوٹی چاچی سے یہ ہماری پہلی ملاقات تھی۔ ان کی شادی میں بھی ہم لوگ نہیں جا سکے تھے۔ ان کی شادی تین سال پہلے ہوئی تھی۔ ابو نے اس رشتہ کو ناپسند کیا تھا۔ تب دادا زندہ تھے۔ یہ انہیں کا فیصلہ تھا۔ انہیں چھوٹے چاچا سے بہت لگاؤ تھا۔ ایک چھوٹے چاچا ہی دادا اور دادی کے ساتھ گاؤں میں رہتے تھے۔ چھوٹے چاچا کے بی اے کرتے ہی دادا نے یہ رشتہ طے کر دیتا تھا۔ ابو کی رائے تھی کہ چھوٹے چاچا پہلے اپنے پیروں پر کھڑے ہوں لیں مگر دادا نے ابو کی بات نہیں مانی تھی۔

شادی کے کچھ دنوں بعد وہ چل بسے۔ ابو دادی کو یہاں لے آئے اور چھوٹے چاچا چاچی کو لے کر مدھیہ پردیش چلے گئے۔ وہاں انہوں نے لکڑی کا چھوٹا سا کاروبار شروع کیا تھا۔ وہیں کہیں آس پاس منجھلے چاچا بھی رہتے تھے۔

آج ہم چھوٹی چاچی کو دیکھ رہے تھے۔ تصور میں وہ ابھی بھی نئی نئی دلہن بنی ہوئی تھیں۔ لال زری دار ساری میں، گھونگھٹ ڈالے، پھولوں سے ڈھکے ہوئے پلنگ کے بیچوں بیچ بیٹھی ہوئی۔ لیکن یہاں سب الٹا تھا۔ ان کو آئے آٹھ دس دن ہو گیا تھا۔ وہ ایک ہی ساری اتارتیں اور دھو کر اسی کو پہن لیتیں۔ اس بیچ وہ ماں کے کپڑے پہنتیں۔ مولا کے پاس بھی صرف دو جوڑے کپڑے تھے۔ جمعہ کی نماز اس نے جنید کے کرتے پاجامے میں پڑھی تھی۔ چھوٹی چاچی کا چہرہ بھی جب سے آئی تھیں، ایک سا تھا، خاموش۔ کسی پرانے تالاب کے پانی سا ٹھہرا ہوا، سناٹوں سے گھرا ہوا، چھوٹے چاچا بھی اس سے بہت الگ نہیں تھے۔ وہ بھی ہمیشہ کسی نہ کسی کام میں لگے رہتے تھے۔ کسی کو بلانا ہوتا، کچھ سامان لانا ہوتا اور کہیں جانا ہوتا تو منجھلے چاچا اور ابو انہیں کو حکم دیتے تھے۔

آج ہم چھوٹی چاچی کو دیکھ رہے تھے۔ تصور میں وہ ابھی بھی نئی نئی دلہن بنی ہوئی تھیں۔ لال زری دار ساری میں، گھونگھٹ ڈالے، پھولوں سے ڈھکے ہوئے پلنگ کے بیچوں بیچ بیٹھی ہوئی۔ لیکن یہاں سب الٹا تھا۔ ان کو آئے آٹھ دس دن ہو گیا تھا۔ وہ ایک ہی ساری اتارتیں اور دھو کر اسی کو پہن لیتیں۔ اس بیچ وہ ماں کے کپڑے پہنتیں۔ مولا کے پاس بھی صرف دو جوڑے کپڑے تھے۔ جمعہ کی نماز اس نے جنید کے کرتے پاجامے میں پڑھی تھی۔ چھوٹی چاچی کا چہرہ بھی جب سے آئی تھیں، ایک سا تھا، خاموش۔

دوسرا، تیسرا، چوتھا اور پانچواں دن بھی گزر گیا۔ دادی کی حالت ویسی ہی رہی۔ گھر میں موجود تمام لوگ دن بھر میں کم سے کم کئی بار ان کے پاس ضرور بیٹھتے لیکن اب ایک کاہلی اور اداسی ان کے چہروں پر صاف جھلکنے لگی تھی۔ ابو اور منجھلے چاچا پہلے سے زیادہ فکرمند دکھائی پڑتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب آتے اور دھیرے دھیرے نہ جانے کیا کیا بول کر چلے جاتے۔ چائے پیتے وقت اس دن منجھلے چاچا نے ابو سے کہا:

'بھائی صاحب! پتہ نہیں خدا کو کیا منظور ہے! پرسوں میرے ایک ٹنڈر کا نیگوسی ایشن ہونے والا ہے۔ اگر میں وقت پر نہیں پہنچا تو سب گڑبڑ ہو جائے گا۔ جی ایم اور سپلائی آفیسر کو ایڈوانس کمیشن بھی دے چکا ہوں۔'

ابو نے سگریٹ کی لمبی ہو چکی راکھ کو راکھدان میں جھاڑتے ہوئے کہا،

'اب بھلا کیا کیا جا سکتا ہے۔ ماں کی حالت تو تم دیکھ ہی رہے ہو۔ اب تب پر اٹکی ہوئی ہے۔ تمہارے جانے پر مجھے اعتراض نہیں ہے لیکن اس وقت تمہارا جانا مناسب نہیں ہے۔'

'میں دوسرے دن فوراً لوٹ بھی آؤں گا۔'

'اور اگر اس درمیان کچھ ہو گیا تو؟'

'یہی تو میں بھی سوچ رہا ہوں بھائی صاحب کہ کیا کروں؟ جس کار سے میں آیا ہوں وہ بھی دوسرے کی ہے اور آج مجھے آئے ہوئے دس دن ہو گئے ہیں۔'

'بھائی! اب میں تمہیں جانے کی صلاح ہرگز نہیں دے سکتا۔ آگے تم جانو، تمہارا ایمان جانے، لیکن ایسے موقعوں پر ہی خدا ہمارا امتحان لیتا ہے۔ ہماری قربانی، ہمارے خلوص اور ہماری محبتوں کو پرکھتا ہے۔ والد صاحب کی موت کے وقت یاد ہے جب تمہیں ٹرنک کال ملا تھا تب رات کے بارہ بج رہے تھے۔ دوسری دن ہی مجھے 'آہوجا ایکسپورٹ' کے ایکسپورٹ کانٹریکٹ پر دستخط کرنا تھا۔ باہر ملکوں میں سپلائی کا کام شروع کرنے کے لئے میں کتنا ہاتھ پیر مار رہا ہوں، اسے تم سے زیادہ کون جانتا ہے؟ وہ ایک گولڈن چانس

تھا مگر میں یہ سب کچھ چھوڑ کر اسی وقت روانہ ہو گیا تھا۔'

منجھلے چاچا چپ ہو گئے مگر چہرے پر بے چینی کے تاثرات بدستور نمایاں تھے۔ ابو نے کرسی کے ہتھے پر پنجے جماتے ہوئے کہا:

'اور اس ایگریمنٹ کے لئے پچاس ہزار روپئے کی جو ایڈوانس رقم جمع کی تھی وہ مجھے ابھی تک رفنڈ نہیں کی گئی ہے۔ سودا ہاتھ سے نکلا سو الگ۔ اب آ ہو جا والوں کا کہنا ہے کہ چونکہ ان کی کوئی غلطی نہیں اس لئے ٹرمس اینڈ کنڈیشن کے مطابق وہ روپئے کمپنی کے پبلک فنڈ میں چلے جائیں گے لیکن میں بھی ہار ماننے والا نہیں ہوں۔ کم سے کم ہائی کورٹ تک تو ضرور کھینچوں گا سالوں کو۔'

ایسا لگا کہ ابو بولتے بولتے کرسی سے اٹھ پڑیں گے پر وہ آرام سے کرسی پر پہلے کی طرح بیٹھ گئے۔ دونوں پیروں کو لمبا کر کے اور سر کو پیچھے ٹکا کر۔

منجھلے چاچا نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:

'تو ٹھیک ہے بھائی صاحب، آپ کو اسٹینڈ ہو چکے ہیں، لیکن میں اس لائن میں نیا نیا ہوں۔ شروعات میں ایسی بات ہو گئی تو پھر آگے کیا ہوگا میرا اور ایڈوانس رقم تو میں نے بھی جمع کی ہے۔'

ابو کے سر میں درد ہونے لگا تھا شاید۔ پیشانی کو ہاتھ سے سہلاتے ہوئے بولے:

'اب تو میری بھی سمجھ میں نہیں آتا۔ میں تمہاری ترقی اور کامیابی کی دعا ہر روز کرتا ہوں لیکن ایسا کچھ مت کرو کہ کل تمہاری جگ ہنسائی ہو، لوگ فبتیاں کسیں کہ لو دیکھو، بڑے رئیس بنے ہیں، ماں کو ایک مٹھی مٹی تک دینے کی فرصت نہیں، دم نکلنے تک نہیں پہنچے۔'

منجھلے چاچا یہ سب سن کر پھر خاموش ہو گئے۔ پریشانی کے عالم میں وہ بھی لگاتار کچھ سوچ رہے تھے اور کچھ بولنا بھی چاہ رہے تھے یا شاید جھجک رہے تھے۔ انہوں نے چھوٹے چاچا کی طرف دیکھا جو دادی کی دواؤں کے نسخہ کی تفصیل پڑھ رہے تھے۔ منجھلے چاچا نے ان سے کہا،

'جمیل! ذرا ڈرائیور کو دیکھو تو، اسے یہیں رہنے کے لئے کہہ دو، پتہ نہیں کب کہاں جانا پڑ جائے۔'

چھوٹے چاچا اٹھ کر چلے گئے۔ ابو نے چونک کر منجھلے چاچا کو دیکھا، 'کیا تم سچ مچ لوٹو گے؟'

منجھلے چاچا نے اپنی بات کہہ دی۔ 'نہیں بھائی صاحب! میں سوچ رہا تھا کہ اگر آپ اجازت دیں تو میں جمیل کو بھیج دوں، کل، گاڑی سے، میں اسے یہیں کوٹیشن بنا کر دے دوں گا۔ اس سے بھائی صاحب کم سے یہ ہوگا کہ ایڈوانس رقم مجھے واپس مل جائے گی۔'

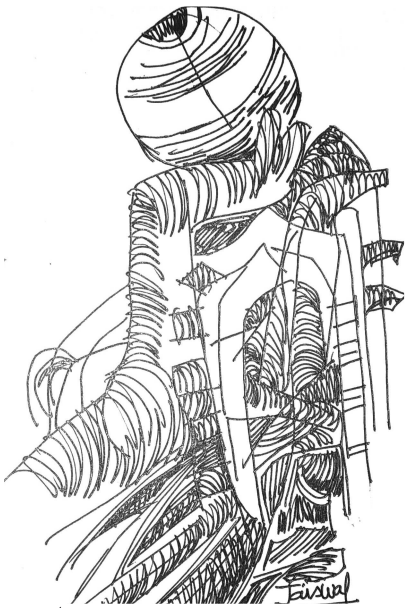

'جمیل! وہ تیار ہوگا کیا؟' سر درد تو نہیں لیکن ابو کی پریشانی مزید بڑھ گئی تھی۔ وہ نئی سگریٹ سلگانے لگے تھے۔

'اور جمیل سے کہے گا کون بھائی؟ وہ بھی تو اسی ماں کی اولاد ہے! کون بیٹا ایسا ہوگا جو ایسی حالت میں جانا چاہے گا؟ تم سوچو! تم سے زیادہ دور سے اور تم سے زیادہ مشکلوں کا سامنا کرتے ہوئے یہاں آیا ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ بیچارے کا ہاتھ تنگ ہے پھر بھی بیوی بچے کو لے کر آیا ہے؟ ماں کو دیکھتے ہو! ویسے اسے دیکھ کر اٹھنے کی کوشش کرنے لگتی ہے، اس سے زیادہ صدمہ کسی کو نہیں پہنچے گا۔'

لمبے لمبے کش اور جلدی جلدی بولنے کی وجہ سے ابو ہانپنے لگے تھے لیکن منجھلے چاچا بھی عجیب قسم کے آدمی معلوم ہوتے تھے انہوں نے اپنے پنجوں کو ایک دوسرے میں پھنسا کر سر کے پیچھے سہارا دیتے ہوئے کہا:

'بھائی صاحب! اگر آپ کہیں گے تو وہ مان جائے گا، بس کل جائے گا اور پرسوں لوٹ آئے گا۔ جب ماں ابھی تک ٹھیک ہے تو انشاء اللہ ایک دو دن میں اور کچھ نہیں ہوگا۔'

ابو نے سر ہلاتے ہوئے کہا، 'نا بابا نا، یہ گناہ مجھ سے نہیں ہوگا کہ مرتے وقت کسی بیٹے کو اس کی ماں سے جدا کر دوں، کیا وہ دودھ پیتا جمو ہے کہ جب چاہا جہاں چاہا دوڑا دیا، انکار کیا تو ڈانٹ دیا۔'

چھوٹے چاچا لوٹ کر آ رہے تھے، پھر منجھلے چاچا اور ابو نے ان سے کچھ کہا یا نہیں لیکن دوسرے دن وہ خود بخود جانے کے لئے تیار ہو گئے۔ چھوٹی چاچی اور مولا کو ساتھ لے کر۔ چھوٹی چاچی کو جب معلوم پڑا تو ان کا رنگ اور سفید ہو گیا۔ رات میں چھوٹے چاچا سے انہوں نے کھانا پروستے ہوئے کہا:

'تم کل جا رہے ہو؟'

'ہاں، بڑے بھیا نے کہا ہے کہ ایک ضروری کام آن پڑا ہے۔'

چھوٹی چاچی نے کچھ نہیں کہا۔ چھوٹے چاچا نے کچھ وقفہ ٹھہر کر کہا، 'فہمینہ! میں چاہ رہا تھا۔۔۔۔' لیکن لفظ گلے سے باہر نکلنا نہیں چاہ رہے تھے جیسے، انہوں نے ایک بڑا نوالا منہ میں بھر لیا تھا، لگا، وہ کھا نہیں رہے ہیں، گایوں کی طرح دھیرے دھیرے جگالی کر رہے ہیں۔ آنکھیں بھی کھانے والی پلیٹ کو نہ دیکھ کر کہیں اور دیکھ رہی تھیں۔ چھوٹی چاچی نے آہستہ سے پوچھا:

'کیا کہہ رہے تھے آپ؟'

'یہی کہ تم بھی ساتھ چلتیں تو ٹھیک رہتا'

'میں؟ ماں جی کی حالت دیکھ رہے ہیں آپ؟ پتہ نہیں کب روح نکل جائے!'

'دیکھ تو رہا ہوں لیکن مجھے ڈر ہے کہ تمہاری طبیعت اور زیادہ خراب نہ ہو جائے، میں تو اسی لئے کہہ رہا تھا'

'جھوٹ کیوں بولتے ہو؟'

'جھوٹ! بھلا میں جھوٹ کیوں بولنے لگا'

انہیں حیرت ہوئی یا انہوں نے جان بوجھ کا ذائقہ بدلا، کچھ صاف نہ ہو سکا۔

'میری طبیعت تو ایک بہانہ ہے تمہارے لئے'

چھوٹی چاچی نے ہاتھ موڑ کر گھٹنوں پر رکھا اور اسی پر اپنا سر ٹکا کر بولیں۔ 'سچ کیوں نہیں کہتے کہ پیسے ختم ہو گئے ہیں اور واپسی کے لئے بھی آپ کو سوچنا پڑ رہا ہے؟'

چھوٹے چاچا چپ چاپ کھانا کھاتے رہے۔

مولا کو جب اپنے جانے کی خبر ملی تو وہ خوش ہوا۔ اس کی ایک وجہ تو ہم خود ہی تھے کہ اب اسے 'میلا' کہہ کر کوئی چڑھائے گا نہیں اور نہ ہی اس کی نیکر میں اب مینڈھ کے بچے چھپے ہوئے ملیں گے۔ وہ جب سے آیا تھا، ہم دونوں بھائیوں سے عاجز آ گیا ہے۔ اب اسے ہم لوگوں سے نجات ملنے جا رہی تھی۔ اس کے خوش ہونے کی دوسری وجہ موٹر کار بھی تھی جس سے شائد آج وہ پہلی بار سفر کرنے جا رہا تھا۔ پورے دن کا سفر۔

چھوٹے چاچا کو تو لوٹ کر دوسرے دن آ جانا تھا مگر چاچی وہیں رک جانے والی تھیں کیونکہ ان کا مکان بہت کم آبادی والے علاقہ میں تھا اور وہ دس بارہ دنوں سے بند پڑا ہوا تھا۔ زمانہ ٹھیک نہیں، چوری ڈکیتی کبھی بھی ہو سکتی ہے۔ جب سے وہ آئی ہیں ان کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں ہے۔ یہاں کی آب و ہوا شائد انہیں راس نہیں آ رہی ہے۔ مولا کو اسکول میں داخلہ دلوانا ہے۔ اسی طرح کی باتوں کا اوڑھنا اوڑھے تینوں لوگ جانے کو تیار ہو گئے تھے۔

روز کی طرح چھوٹی چاچی اس دن بھی سب سے پہلے سو کر اٹھیں۔ انہوں نے دادی کا بلغم سے بھرا گال دان اور بیڈ صاف کیا۔ اسے دھو مانجھ کر چارپائی کے نیچے رکھ دیا اور خود ہاتھ منھ دھو کر ناشتے کی تیاری میں لگ گئیں۔ جب ہم روٹی کھا رہے تھے تو مولا بھی وہیں تھا۔ وہ کونے میں بیٹھا رو رہا تھا۔ اس نے گھٹنوں میں اپنا چہرہ چھپا رکھا تھا۔ اس کے سامنے روٹی رکھی ہوئی تھی اور سبزی کا برتن اوندھا پڑا ہوا تھا۔ نیچے بکھری ہوئی سالن پر مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ مجھے حیرت ہوئی، چھوٹی چاچی کو دیکھ کر، وہ کبھی مولا کو اس طرح نہیں چھوڑتی تھیں۔ وہ جب بھی روتا، اسے گود میں اٹھا لیتیں۔ انہیں میں دس دنوں سے دیکھتا آ رہا تھا۔ وہ توے پر روٹی سینک رہی ہوتیں تو بھی مولا ان کی گود میں ہی رہتا۔ بہت دیر تک جب وہ روتا رہا تو میں نے پوچھا:

'یہ کیوں رو رہا ہے؟ چھوٹی چاچی!'

'ایسے ہی' ان کے جواب میں روکھا پن تھا۔

'ایسے ہی کیوں؟' کل تک تو یہ جانے کے نام پر بڑا خوش تھا۔

چھوٹی چاچی جھک کر چولہے سے راکھ جھاڑنے لگیں۔

'پاگل ہے، تمہاری دادی کو بھی ساتھ لے جانا چاہتا ہے'

'تو آپ لوگ کیوں جا رہے ہیں؟ چاچا سے کہئے نا کہ رُک جائیں'

جواب میں انہوں نے اور روٹی کے لئے پوچھا تو مجھے چپ ہو جانا پڑا۔ مولا وہیں روتے روتے سو گیا۔

کچھ دیر بعد چھوٹے چاچا اور چھوٹی چاچی چلنے کے لئے تیار ہو گئے تھے تو اماں نے ان سے دادی سے مل لینے کو کہا۔ چھوٹی چاچی دادی کی چارپائی کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی۔ چاچا وہیں بیٹھ کر دادی کو دیکھنے لگے۔ آنکھیں بند تھیں۔ وہ جھک کر بولے:

'ماں! ہم لوگ جا رہے ہیں، ماں سن رہی ہو نا تم؟ کل پھر لوٹ آؤں گا ماں!'

دادی کے بیجان جسم میں تھوڑی حرکت ہوئی۔ پہلے انہوں نے ہاتھ اٹھانا چاہا مگر اٹھا نہ سکیں۔ پھر ان کے ہونٹوں سے بھر بھراہٹ نکلی:

کون ہے یہ؟

'ماں! میں ہوں چھوٹے! میں چھوٹے ہوں ماں' اور چھوٹے چاچا اچانک رونے لگے۔ بچوں جیسی اونچی آواز میں۔ ماں نے ان کو سنبھال لیا نہیں تو وہ دادی سے ہی لپٹ پڑتے۔ ان کا یوں بلکھ کر رونا مجھے بڑا عجیب لگا۔ ان کی آنکھوں سے دھار دار آنسو بہہ رہے تھے۔ ہچکیوں کے درمیان ان کی آواز بڑی مشکل سے باہر آ رہی تھی۔

'ہمیں معاف کر دینا ماں! ہم لوگ جا رہے ہیں'

ان کا رونا کسی طرح بند نہیں ہو رہا تھا۔ ابو جیسے انہیں کھینچتے ہوئے باہر لے گئے اور سمجھاتے رہے:

'چھوٹے! ایسے روتے ہیں؟ خدا کے آگے کسی کی چلی ہے؟' شاید ڈانٹ بھی رہے تھے۔ 'مرد ہو کر اتنے نازک رہو گے تو بچوں اور عورتوں کا کیا ہوگا۔ دیکھو! آنسو پوچھو اور گاڑی میں بیٹھ جاؤ۔ ہم سب ہیں یہاں'

ان کو روتا دیکھ کر چھوٹی چاچی بھی سسکنے لگیں۔ پھر وہ بھی زوروں سے رونے لگیں۔ دادی کے پیروں میں سر رکھ کر۔ ہم دونوں بھائی وہیں کھڑے تھے۔ چھوٹے چاچا اور چاچی کو دیکھ کر مجھے علی کی بات یاد آئی۔ مجھے شک ہوا۔ میری نظر دادی پر ٹک گئیں۔ سینے کی پاس کی چادر کا حصہ بہت آہستہ آہستہ اوپر نیچے ہو رہا تھا۔ سانسیں اب بھی چل رہی تھیں۔ آنکھ کی پلکیں بیٹھی ہوئی تلی کے پنکھ کی طرح کانپ رہی تھیں۔ ہم دونوں پھر پس و پیش میں پڑ گئے۔

زندہ ہیں تو پھر یہ لوگ ابھی سے کیوں ان کا ماتم کر رہے ہیں؟ ان سب کا مطلب؟ میں نے چھوٹی چاچی کی طرف دیکھا۔ وہ عام دیہاتی عورتوں کی طرح ایک طرح سر بنا کر رو رہی تھیں۔ ایک ایک سے لپٹ کر۔ منجھلی چاچی اسے چپ کرانے میں لگی ہوئی تھیں۔ مگر اس کوشش میں وہ خود بھی رونے پر اتر آئیں اور وہاں سے ہٹ گئیں۔ اب امی چھوٹی چاچی کو چپ کرانے میں لگ گئیں۔ 'چھوٹی بہو! چپ ہو جاؤ۔ ماں جی کو کیسا لگ رہا ہوگا تم لوگوں کو ایسا دیکھ کر۔' لیکن ان باتوں کا ان پر ذرا بھی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ وہ ابھی بھی اسی طرح رو رہی تھیں۔ امی نے اپنی عینک سنبھالتے ہوئے ایک بار پھر انہیں ڈھارس بندھایا۔ 'فہمینا! اب بس بھی کرو میری بہن! تمہارے جتنے آنسو گریں گے، ماں جی کو اتنی ہی زیادہ تکلیف ہوگی۔ کیا تم چاہتی ہو کہ آخری وقت میں انہیں تکلیف پہنچے؟'

بہت دیر تک رونے کے بعد چھوٹی چاچی چپ ہو گئی تھیں۔ لگتا تھا وہ آج پہلی بار روئی ہیں۔ آنکھیں لال ہو گئی تھیں۔ بھرا بھرا چہرہ اتنا ہی خالی اور سونا ہو گیا تھا۔ چلتے ہوئے لگ رہا تھا کہ وہ لڑکھڑا کر گر پڑیں گی۔ گاڑی میں بیٹھ کر چلنے تک ان کی سسکیوں کی آواز فضا میں دھوئیں کی طرح پھیل رہی تھی۔ چھوٹے چاچا مولا کا سر گود میں لئے ہوئے کھڑی سے لگ کر بیٹھے تھے۔ میں نے اچک کر اندر دیکھا، مولا اب تک سو رہا تھا۔

اور دوسرے ہی دن صبح صبح، تب شاید صبح بھی پوری طرح سے نہیں ہوئی تھی، مسجد کے مائک سے اذان کی آواز آ رہی تھی اور شائد اسی وقت دادی کی موت ہوئی ہوگی۔ ایسا لوگوں کا اندازہ تھا۔ سب سے پہلے امی گئی تھیں، دادی کے کھلے پیروں کو ڈھکنے کے لئے۔ ہماری طرف کسی کا دھیان ہی نہ تھا۔ اٹھتے ہی ابو نے مولوی صاحب کو بلا لانے کے لئے کہا۔ منجھلے چاچا بھی کہیں گئے ہوئے تھے۔ سبھی عورتیں دادی کے کمرے میں جمع تھیں۔ منجھلی چاچی ایک طرف پاؤں پسارے گم سم بیٹھی ہوئی تھیں۔ ماں نماز پڑھ کر کلام پاک کی تلاوت کر رہی تھیں۔ دادی کا جسم سر سے پاؤں تک چادر سے ڈھکا ہوا تھا۔ ان کے سرہانے چاول سے بھرے گلاس میں اگربتی جل رہی تھی۔

منجھلی چاچی کا گم سم چہرہ! اگربتی کی خوشبو اور تلاوت کی آواز۔ ان سب نے مل کر کمرے اور وہاں کی ہر چیز کے بیحد ڈراؤنے احساس کو ڈھک دیا تھا۔ کچھ دیر بعد گھر میں موجود اور پڑوس کی عورتوں نے مل کر دادی کو غسل کرا دیا۔ اب چھوٹے چاچا کا انتظار ہونے لگا۔ جنازے کی تمام تیاریاں مکمل ہو گئیں۔ شام گھر آئی تھی۔ بہت سارے لوگوں نے کچھ دیر ٹھہرنے کے لئے کہا۔ مگر اتنے ہی سارے لوگوں نے اسی دن

ہمارے آنسوؤں کا مطلب دادی سے وہ کہانی والا پیار نہیں تھا، ہمارے آنسو دادی کا ماتم کرنے کے لئے نہیں نکلے تھے۔ آج لگتا ہے کہ وہ ماتم ان زندہ رشتوں کی موت پر تھا جو مرے ہوئے رشتوں سے زیادہ ٹھوس ہوتا ہے اور زیادہ رلانے والا ہوتا ہے جیسے مضبوط دانت کے ٹوٹنے کا درد ہلتے ہوئے دانت کے ٹوٹنے کے درد کے مقابلے کہیں زیادہ اذیت ناک ہوتا ہے۔

تدفین کی رائے دی۔

جب جنازے کو اٹھا کر باہر لے جانے لگے تو گھر کی سبھی عورتیں رونے لگیں۔ پھوپھی، منجھلی چاچی، امی، دادی کی چھوٹی بہن اور دو چار پڑوس کی دوسری عورتیں بھی رونے میں ان کا ساتھ دے رہی تھیں۔ مجھے چھوٹی چاچی کی یاد آئی۔ ان کی طرح بے تکے ڈھنگ سے کوئی تو بین نہیں کر رہا تھا۔ ابو اور منجھلے چاچا کو تو میں نے ابھی تک روتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ منجھلے چاچا تو قبر کھدوانے کے لئے صبح ہی سے بھاگ دوڑ میں لگے ہوئے تھے۔ ابو مسلسل اپنے کمرے میں کچھ دوستوں کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ جنازے کو لے جانے کے وقت ہی باہر آئے۔

دوسرے دن ہی سے مہمانوں کا لوٹنا شروع ہو گیا۔ قرآن خوانی کے بعد چاچا بھی چاچی کو لے کر لوٹ گئے لیکن چھوٹے چاچا اب تک نہیں آئے تھے۔ دوسرے دن، تیسرے دن، چوتھے دن اور آج چودہ پندرہ برس تک وہ نہیں آئے۔ ہم آج بھی علی کی طرح مہینے میں ایک دن قبرستان جاتے ہیں۔ اسی کی طرح دادی کی قبر پر خراج عقیدت پیش کرتے لیکن بہت ساری باتوں کے ساتھ ساتھ ایک بات آج تک نہیں سمجھ سکا کہ دادی کی موت کس دن ہوئی تھی۔ اگر اسی دن ہوئی تھی چھوٹے چاچا اور چھوٹی چاچی اس کے ایک دن پہلے ہی اس طرح سے پھوٹ پھوٹ کر کیوں رو رہے تھے کہ انہیں کوئی چپ نہیں کر سکا تھا۔ دلاسے اور ڈھارس دینے والی آنکھیں اور ہاتھ خود یتیم ہو گئے تھے۔ بے بس اور لاچار اور کیوں دوسرے دن ان دونوں کا وہاں نہ ہونا ہمیں کھٹکتا رہا تھا۔ ہمارے چاروں جانب کا ماحول رنج و ملال سے بھر گیا تھا۔

ہمارے آنسوؤں کا مطلب دادی سے وہ کہانی والا پیار نہیں تھا، ہمارے آنسو دادی کا ماتم کرنے کے لئے نہیں نکلے تھے۔ آج لگتا ہے کہ وہ ماتم ان زندہ رشتوں کی موت پر تھا جو مرے ہوئے رشتوں سے زیادہ ٹھوس ہوتا ہے اور زیادہ رلانے والا ہوتا ہے جیسے مضبوط دانت کے ٹوٹنے کا درد ہلتے ہوئے دانت کے ٹوٹنے کے درد کے مقابلے کہیں زیادہ اذیت ناک ہوتا ہے۔

اس وقت چھوٹی چاچی اور چھوٹے چاچا کا درد ہمارے لئے ایسا تھا کہ ہم ان کے دکھ میں پوری طرح سے شامل نہیں ہو سکے تھے لیکن افسوس اور فکروں کو جمع کرنے والے احساس، ان کی یاد آنے پر ہم اب بھی ہوا کے ساتھ محسوس کرتے ہیں اور اداس ہو جاتے ہیں اور یہ اداسی اتنی گہری ہے اور اتنی اپنی ہے کہ آج تک ہم اپنی دادی کی موت کا ذکر کسی سے نہ کر سکے۔

❑❑❑

غزلیں

الماس شبی
سی ای او، پنچ ریڈیو
امریکہ

غم ہنسی میں چھپا دیا ہوگا
چشم نم نے بتا دیا ہوگا

بھول جانے کی اس کو عادت تھی
اس نے مجھ کو بھلا دیا ہوگا

ایک خط تھا ثبوت چاہت کا
وہ بھی اس نے جلا دیا ہوگا

رات چپکے سے لے اڑی تھی ہوا
راز دل کا بتا دیا ہوگا

ہجر کے مارے دل کو بھی اس نے
جانے کیسے سلا دیا ہوگا

پھر بلایا ہے آج ناصح نے
گل کسی نے کھلا دیا ہوگا

ہے یقیں مجھ کو ذکر پر میرے
وہ فقط مسکرا دیا ہوگا

میں کہاں اور کیسی ہوں اس کو
اسی غم نے گھلا دیا ہوگا

خوب تم نے یہ نکالی صورت
مجھ سے ہی اپنی چھپا لی صورت

اک ذرا آنکھ جھکی اور تم نے
آئینے سے ہی ہٹا لی صورت

نام جس سے بھی سنا ہے تیرا
اس کی جانب ہی گھما لی صورت

ہم ترا وعدہ لئے بیٹھے ہیں
کوئی تم نے نہ نکالی صورت

پھر بندھا رہ گیا سامان سفر
تم نے کچھ ایسی بنا لی صورت

ریشم و اطلس و کمخاب اندام
اور اس پر یہ مثالی صورت

پوچھتا ہوگا یہ آئینہ بھی
کس نے وہ تیری چرا لی صورت

کُل جمع ٹوٹل میزان

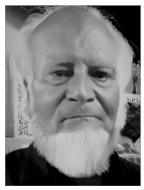

طارق شاہین
۱۷۰، خضر آباد کالونی، کھجرانہ، اندور
موبائل: 9893253546

ممبئی پولیس کمشنر کے عہدے کے لئے اپائنٹ لیٹر کا ایک میل ملتے ہی میں نے اتنی زور قہقہہ لگایا کہ گھر کے تمام افراد میرے آس پاس جمع ہو گئے۔ نیٹ پر اپنا بایوڈاٹا (Biodata) ڈالنے کا یہی تو عیب ہے۔ نوکری دینے والی سائٹ (Site) جانے کون کون سی جگہ (Apply) کرنے کا مشورہ دیتی ہیں مگر یہ تو الگ ہی معاملہ تھا۔ میں نے کوئی درخواست نہیں دی پھر بھی ممبئی کے بڑے والوں نے میرا بایوڈاٹا دیکھ کر مجھے نوکری دیتے ہوئے لکھا تھا کہ آپ جلدی جوائن (Join) کرلیں۔ یہاں حالات بہت ہی نازک ہیں۔ ہم پلین کے اوپن ٹکٹ بھیج رہے ہیں۔

لیکن بھائی میں اس کام کے لائق بالکل بھی نہیں ہوں۔ مجھے پولیس انتظامیہ (Administration) یا جرائم پر روک کا ذرا بھی تجربہ نہیں ہے۔

ہمیں علم ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہم نے آپ کی تحریر اور نادر کہانیوں کو پڑھ کر ہی آپ کا انتخاب کیا ہے۔ ہمیں پورا یقین ہے کہ آپ اپنی مضبوط قوت ارادی اور دور اندیشی سے ممبئی کو سدھار سکتے ہیں۔

مگر بھائی آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ میرا قد صرف پانچ فٹ ساڑھے تین انچ اور وزن فقط اٹھاون کلو ہے۔ ساتھ ہی آنکھوں پر موٹا چشمہ بھی لگتا ہے۔

آپ کو کون مافیا سے کشتی لڑنا ہے۔ آپ کا انتخاب ہم نے کیوں کیا ہے، یہ آپ کے سوچنے کا موضوع نہیں ہے۔ آپ تو بس آجایئے۔ کب آرہے ہیں؟

عجیب لوگوں سے پالا پڑا ہے۔ مان کر چل رہے تھے کہ میں اپنی پرسکون زندگی چھوڑ کر کہیں بھی نوکری کر لوں گا۔ میں نے انہیں سمجھانے کی آخری کوشش کرنا چاہی۔

''سنو بھائی.....'' لیکن بات بیچ ہی میں کاٹ کر انہوں نے ٹکا سا جواب دیتے ہوئے کہا:

> پیسوں کی ضرورت کسے نہیں ہوتی؟ مجھے بھی ہے۔ اسی وجہ سے تو اپنا مکمل تعارف انٹرنیٹ پر پٹکا تھا مگر میں ایسی نوکری کیسے کر لوں جو مجھے مشین کی حد تک مصروف کر دے اور جس کے لئے میں خود کو کبھی بھی اہل نہیں سمجھتا ہوں۔ ممبئی پولیس کمشنر کے عہدے۔ گھر میں گرما گرم بحث شروع ہو چکی تھی۔
>
> میں فیصلے سے پہلے یہ جان لینا چاہتا تھا کہ مجھے ہی کیوں ان لوگوں نے قربانی کے لئے چنا تھا؟ ساتھ ہی میں یہ بھی معلوم کرنا چاہتا تھا کہ زندگی میں آپ جو بھی پسند نہیں کرتے، وہ سب آپ کو آسانی سے کیوں مل جاتا ہے۔ میری دادی ماں نے تو بس ایک ہی رٹ لگا رکھی تھی کہ اتنا موٹا تعویذ اور مالا گلے میں لٹکائے پھرے گا تو رات کو خواب بھی نوکری کے ہی آئیں گے۔

دیکھئے آپ مجھے 'بھائی' کہنا بند کیجئے۔ میں 'بھائی' نہیں ہوں بلکہ یہاں آکر آپ کو سب سے پہلے 'بھائی' لوگوں کا ہی علاج کرنا ہے۔ شام تک آپ کو ٹکٹ مل جائیں گے۔ آپ کل صبح کی فلائٹ لے سکتے ہیں۔

ابھی کچھ دنوں پیشتر ہی ایک ایسا اور واقعہ ہو چکا تھا۔ مجھ سے پوچھے بنا ہی مجھے رتلام کا ایس پی (Superintendent of Police) بنا دیا گیا۔ مانا کہ قابل لوگوں کی کمی ہے اور نااہل حضرات کی بھرمار جس کا اندازہ گزشتہ دنوں ہمارے شہر میں فساد کے دوران لوگوں کو صاف دیکھنے کو ملا تھا۔ نااہل اور ناتجربہ کار افسران کی وجہ سے چند فرقہ پرست عناصر نے پورے شہر کو اپنی گرفت میں لے کر شہری سکون کو نہ صرف برباد کر دیا تھا بلکہ پورے شہر میں وہ وحشیانہ ناچ شروع کیا جسے دیکھ کر انسانیت و آدمیت بھی شرمندہ ہوگئی اور ان سارے مناظر کا دردناک پہلو یہ ہے کہ ہمارے محافظ ان ظالمانہ انداز اور وحشیانہ بربریت کے مناظر کو خاموش تماشائی کی طرح دانستہ دیکھتے رہے لیکن ایسی بھی کیا قلت کہ آپ مجھ جیسے آدمی سے توقع کریں کہ میں طالبان کے ذریعہ تمل ٹائیگر کو بھیجی جا رہی بھوری شکر کو رتلام میں پکڑ لوں گا۔ لیکن وہ بضد تھے۔ ان کی دلیل تھی کہ آپ کی تحریروں میں جاسوسی کے کچھ ہنر بھی نمایاں طور پر پوشیدہ نظر آتے ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ آپ کی کہانیاں ہی پڑھ کر ہم نے دیواس سے کلکتہ بھیجے جا رہے کدو کے ٹرک سے افیون ضبط کی تھی۔ پیسوں کی ضرورت کسے نہیں ہوتی؟ مجھے بھی ہے۔ اسی وجہ سے تو اپنا مکمل تعارف انٹرنیٹ پر پٹکا تھا مگر میں ایسی نوکری کیسے کر لوں جو مجھے مشین کی حد تک مصروف کر دے اور جس کے لئے میں خود کو کبھی بھی اہل نہیں سمجھتا ہوں۔ ممبئی پولیس کمشنر کے عہدے۔ گھر میں گرما گرم بحث شروع ہو چکی تھی۔

میں فیصلے سے پہلے یہ جان لینا چاہتا تھا کہ مجھے ہی کیوں ان لوگوں نے قربانی کے لئے چنا تھا؟ ساتھ ہی

میں یہ بھی معلوم کرنا چاہتا تھا کہ زندگی میں آپ جو بھی پسند نہیں کرتے، وہ سب آپ کو آسانی سے کیوں مل جاتا ہے۔ میری دادی ماں نے تو بس ایک ہی رٹ لگا رکھی تھی کہ اتنا موٹا تعویذ اور مالا گلے میں لٹکائے پھرے گا تو رات کو خواب بھی نوکری کے ہی آئیں گے۔ لیکن نوکری تو مجھے کرنا ہی ہے۔ یوں ہی اردو میں لکھتا رہوں گا تو تیس برس میں اتنا کما سکوں گا کہ تین سال کا خرچ بہ مشکل چل پائے گا۔ مالا اور تعویذ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے میں نے خود سے کہا۔

دادی ماں نے طنزیہ لہجے میں کہا:

''ہاں بیٹا! تو نے بات تو ٹھیک ہی کہی ہے۔ اردو مصنف اور شاعر ہونا بھیک مانگنے سے شاید کچھ بہتر نہ ہوئے۔ لیکن کسی حد تک قابل احترام ضرور ہے۔ کبھی کبھی میں بھی یہ سوچ کر کاتب تقدیر کا لکھا ہوا، ربر لے کر مٹانے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہوں لیکن اس تحریر کو کہاں مٹنا ہے۔ پھر سوچتا ہوں کہ یہ شاید کسی گناہ کی سزا ہے۔ حالانکہ میں بخوبی واقف ہوں کہ گناہوں کی عبارت کو صرف اور صرف ندامت کے بے شمار اور مسلسل آنسو ہی مٹا سکتے ہیں۔ نوکری تو بہر حال مجھے کرنا ہی ہے۔ کب تک ادب کے چکر میں اپنے شب و روز روئی کی طرح اڑاتا رہوں گا اور سانسوں کو مصرعے موزوں کرنے کے عمل میں برباد کرتا رہوں گا یعنی کمبل اوڑھ کر کب تلک بیڑھی پیتا رہوں۔ کب تک یوں ہی رشتہ داروں کے ٹکڑوں پر پلتا رہوں۔ میری دادی کا بھی یہی ماننا ہے کہ اس پوری جائداد میں میرا کچھ نہیں ہے اور میں جنہیں اپنا سمجھ کر جان چھڑکتا آ رہا ہوں وہ ایسے رشتہ دار ہیں، مانو جن کے ٹکڑوں پر میں پل رہا ہوں۔ میری دادی شاید اپنے ڈھنگ کی اکیلی ہیں جو ایک اور ایک گیارہ کے مثالی جملے کے خلاف مجھے سمجھاتی ہیں۔ بیٹا! انسان زندگی میں اکیلا ہے اس کے اپنے کئے سے ہی اپنی پہچان بنتی ہے۔ زندگی میں جب ہم خود کو سب سے جڑا محسوس کر رہے ہوتے ہیں، اکثر اسی لمحہ ہمیں پتہ چلتا ہے کہ ہم بالکل اکیلے ہیں۔ ہر ایک اپنی مستی میں ہے۔ زندگی کو معنی نہیں دوگے تو سکون سے محروم رہوگے۔ دادی اپنی نصیحتوں کا پٹارا پھر سے کھولتی ہیں۔

قبل اس کے کہ میں کچھ مزید سوچتا دوسرا اپائنٹمنٹ لیٹر (Appiontment Letter) آ گیا اور گھر کے تمام ارکان نے ہم خیال ہو کر ایک نعرہ بلند کیا ''واقعی اس مالا اور تعویذ میں دم ہے۔'' اس بار ایک عالیشان مال میں چوروں کو پکڑنے کا کام تھا، نہ جانے میرے بایوڈاٹا میں ایسا راز کیا پوشیدہ ہے کہ نوکری دینے والوں کی نظر میں سیکورٹی آفیسر (Security Officer) یا پولیس کی وردی والی نوکری کے لائق ہی اچھا لگتا ہوں۔ شاید اسی کو جنم پتری کا پھیر یا ہتھیلیوں کی لکیروں کا کمال کہا جاتا ہے۔ میں بھی اعجاز عبید کے اس شعر میں کھو جاتا ہوں:

ہتھیلیوں میں لکیروں کا جال ہے کتنا
مرے نصیب میں میرا زوال ہے کتنا

خیر مجھے کچھ تو کرنا ہی ہے۔ کچھ جمع کر لوں گا تو آنے والے دن تاریکی سے محفوظ رہیں گے۔ اسی خیال سے میں عالیشان مال کی نوکری والی تجویز منظور کر لیتا ہوں۔

میں نے ہاں کیا کر دی۔ خاصی مصیبت مول لے لی۔ اس عالیشان مال میں دنیا بھر کا ہر مال دستیاب تھا بلکہ اپنے آپ میں وہ خود ایک دنیا تھی۔ ایک مکمل کائنات تھی۔ اگر آپ ایسی کوئی چیز بتا دیں جو وہاں نہیں ملتی تو اس پر آپ کو انعام بھی دیا جاتا تھا۔ ۱۸۲۸ء کا ڈاک ٹکٹ بھی وہاں ملتا تھا اور چاند پر تعمیر ہونے والی کالونی کے پلاٹ کی بکنگ بھی ہوتی تھی۔ مانا جاتا تھا کہ جو بھی ایک بار اس مال سے گزر گیا اس نے آج کی دنیا دیکھ لی لیکن مصیبت یہ تھی کہ کوئی ایک چور وہاں گزشتہ کئی دنوں سے آتا تھا اور لگاتار وہاں کی چیزیں چرا لے جاتا تھا۔ باوجود کئی کوششوں کے مال کے سکیورٹی افسران اس کو پکڑنے میں ناکام ثابت ہو رہے تھے۔ حقیقت تو یہ تھی کہ نامعلوم چور کو پکڑنے میں مال کے کئی سکیورٹی کے لوگ اپنی جان تک گنوا چکے تھے۔ مال کا مالک کون ہے، یہ کسی کو پتہ نہیں تھا۔ کچھ لوگ دعویٰ کرتے تھے کہ انہوں نے کسی خاص موقع پر مالک کے دیدار کئے تھے اور اس دعوے کی وجہ سے وہ پورے مال میں کسی اہم شخصیت کی طرح قابل احترام ہو گئے تھے۔

میں نے اپنی سوجھ بوجھ سے اس چور کی تلاش شروع کر دی۔ جوانی کے جوش کی طرح میں کہیں بھی جا سکتا تھا، کسی کو بھی چیک کر سکتا تھا۔ چور کو پکڑنا میری خواہش تھی اور رفتہ رفتہ یہ خواہش جنون میں تبدیل ہونے لگی۔ آپ جانتے ہیں کہ خواہش مشکل کو بھی آسان بنا دیتی ہے لیکن وہ خواہش ہی کیا جس میں صرف اور صرف آسانیاں ہوں۔ اس طرح کی آسانیاں، بے ذائقہ اور بدمزہ لگتی ہیں لیکن میرا کام آسان نہیں تھا۔ میں ایک سیکشن میں اس کے لئے جال بچھاتا تو وہ دوسرے سیکشن میں کام دکھاتا جاتا۔ کچھ مشکلیں ایسی تھیں جو بیان کے دائرے سے باہر تھیں۔ جیسے ایک دن اس نازک اور مصنوعی چمڑے کے اسٹال

> کچھ دیر بعد لوگ دادی کے کمرے سے ایک ایک کر کے جانے لگے۔ ابو اور منجھلے چاچا پہلے جا چکے تھے۔ منجھلی چاچی دادی کو چمچ سے سنترے کا جوس پلا رہی تھیں۔ امی وہیں بیٹھی تسبیح پڑھ رہی تھیں۔ چھوٹی چاچی کو انہوں نے اشارہ سے رسوئی میں جانے کے لئے کہا کیونکہ دوپہر کا وقت ہونے جا رہا تھا اور کھانا ابھی تک نہیں بنا تھا۔ ہم دونوں بھائی بھی چپ چاپ کمرے سے نکل کر اسٹڈی روم میں آ گئے اور بستے میں چھپائے کنچے نکال کر گننے لگے۔ تبھی مجھے علی اور وقار کی یاد آئی۔ عین ان کا اس وقت یاد آنا مجھے بڑا اچھا لگا۔ کیا بیتے گی علی پر جب اسے معلوم ہوگا کہ ہماری دادی گزر گئیں۔ بیچارہ جل کر رہ جائے گا۔ ویسے سر تان کر چلتا تھا ہمارے سامنے جیسے اللہ کبھی ہماری سنے گا ہی نہیں۔ دنیا بھر میں ایک بدنصیب ہم ہی ہیں۔ نہ ہمارا کوئی قبرستان میں دفن ہے اور نہ کوئی ٹیچر ہے ہمارے یہاں۔

پر سویتا نے مجھے ٹوکا، کیوں اس چور کو تم صرف باہر ہی تلاش کرتے ہو۔ اندر بھی جانچ کرو۔ اتنا تو تم جانتے ہی ہوگے کہ اصلی چور اندر ہی ہوتا ہے۔ اندر کی بات کہہ کر اندر کی جانچ میں بری طرح الجھا دیا تھا اسے نے مجھے۔ سویتا نے اپنی بات منوا کر اور آگے بھی مانتے رہنے کا وعدہ لے کر ہی چھوڑا۔ پھر ایک دن جب اکاؤنٹ کی جانچ کرتے ہوئے میں نے کیشئر قسم کے آدمی سے پوچھا تھا، دن بھر کا جمع لکھ کر آپ جہاں ٹوٹل کرتے ہیں وہاں کل جمع ٹوٹل میزان کیوں لکھتے ہیں؟ صرف کل میزان کیوں نہیں لکھ دیتے؟ تو غلطی ماننے کے بجائے اس نے کہا: آپ یہاں اردو ٹیچر کی حیثیت سے آئے ہیں کیا؟ جائیے! اپنا کام دیکھئے۔ چور تو پکڑا نہیں جاتا، ہمیں پڑھانے میں وقت برباد کر رہے ہیں۔ ہاں یاد آیا، مال کی دنیا بھی عجیب وغریب ہے۔ یہاں کسی کو درست کرنے کی روایت دیمک زدہ اور ناقابل قبول ہے۔ کیشئر قسم کے آدمی کا دیا ہوا بے عزتی کا نوالہ پا کر میں مزید جنونی کیفیت کے ساتھ چور کی تلاش میں جٹ گیا۔ میں چور کے کام کرنے کا انداز، اس کے ارادے یہاں تک کہ اس کی ہوا تک کو پہچاننے لگا تھا لیکن باوجود ہر کوشش کے چور میری پکڑ سے باہر تھا۔ میں جب بھی مال میں کام کرنے والے اسٹاف کی نظروں میں دیکھتا تو مجھے ان کی آنکھوں میں صرف ایک ہی سوال دکھائی دیتا جیسے وہ مجھ سے پوچھ رہی ہوں۔ حرام خور، بیٹھے کی تنخواہ ہی لیتے رہوگے یا کبھی چور کو بھی پکڑوگے؟ یہاں سے وہاں دن بھر منڈراتے رہنا اور ٹکڑے توڑنا ہی تمہاری زندگی ہے کیا۔ کب تلک مفت کی تنخواہ لیتے رہوگے۔ تم اس مال کے نوکر ہو یا کسی مندر کے پجاری کی طرح جس کا کام ہی ہے مفت کا چندن، گھس میرے نندن کا عمل دہراتے رہنے کو ہی وہ اپنی زندگی کا مقصد سمجھتا ہے۔

تم کیوں ان کی طرف دھیان دیتے ہو؟ وہ بھلا کون سے ایماندار ہیں، لگے رہو، دیکھنا تم جلد ہی چور کو پکڑ لوگے۔ یہ سمجھاتے ہوئے سویتا اس کامیاب عورت کے کردار میں آجاتی ہے جو کامیاب آدمی کے پیچھے ہونے کا دعویٰ کرتی ہے۔ ان دنوں میں کئی بار یہ بھی سوچنے لگا ہوں کہ اصل میں گنتی ان ناکام آدمیوں کی ہونی چاہئے جو اپنی پیچھے والی عورت کے باعث ناکام ہوتے ہیں۔ جوانی کی کل جمع طاقت، ساری چستی ٹکڑے توڑتے ہوئے، بڑھاپے کے لئے کچھ ٹکڑے جوڑتے ہوئے بیت رہی ہے۔

میں ناکامی کے تناؤ میں کبھی بھی گرفتار ہوسکتا تھا اور اگر میں یہ کہوں کہ میں اس صورت حال سے کبھی بھی

دو چار ہونے کے امکان محسوس کر رہا تھا تو غلط نہ ہوگا۔ یہی سوچ کر میں نے ایک بار پھر اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کے لئے ایک بزرگ کی دی ہوئی مالا پر ہاتھ پھیرتے ہوئے سوچا کہ چور نہ ملے کوئی اور اس سے بہتر دوسری نوکری مل جائے۔

تبھی اچانک مجھے چور دکھائی دے گیا۔ میں نے بتایا نا، میں اس کی ہوا تک پہچاننے لگا تھا۔ اسی لمحے مجھے ہوا سی محسوس ہوئی تھی۔ میں نے آس پاس دیکھا، اس کی اور میری نگاہ ملی۔ میرے دیکھنے پر اگر وہ چونکتا نہیں، چونک کر بھاگتا نہیں تو میں اسے بھی عام گاہک مان کر دوسری جانب دیکھنے لگتا مگر وہ پیچھے ہٹ کر بھاگنے لگا۔ شاید ایسا موقع دوبارہ نہیں آئے گا۔ یہ سوچ کر میں تیزی سے اور جان لگا کر اس کے پیچھے بھاگا۔ مجھے بھاگتا دیکھ کر مال میں ہلچل مچ گئی۔ لیکن میرے راستے میں جو بھی تھے، انہوں نے اسے روکا نہیں بلکہ اس کے راستے سے ہٹ گئے۔ مانو وہ کوئی غیر معمولی شخصیت ہو۔ میں نے سوچا یہ موقع نہیں ایک چیلنج ہے، اسے غنیمت جانو۔ سب دیکھنا چاہتے تھے میری اس دوڑ کو۔ شاید یہ میرے امتحان کی گھڑی تھی۔ میں ٹکڑوں کی قیمت چکانے میں کامیاب ہوتا ہوں کہ نہیں۔ موقع ہو یا چیلنج، میں نے اپنے جسم پر اپنوں کی بے رخی کا کوچ اوڑھ بھاگنا شروع کر دیا۔

میں اس کے پیچھے بھاگ رہا تھا، ڈپارٹمنٹ، کمرے، گلیارے، سیڑھیاں یہاں تک کہ مین گیٹ پر کھڑا پہرے دار بھی ہماری دوڑ دیکھنے کے لئے پیچھے ہٹ گئے تھے۔ جب کہ اسے روکنا سب کی ذمہ داری تھی، سب کا اخلاقی فرض تھا لیکن ہمارے معاشرے میں آج کل ذمہ داری اور فرض کو نظر انداز کرنا عام بات ہوگئی ہے۔ تمہیں تو میں کامیابی کے بعد دیکھوں گا، اپنی بے سہارا، ناراضگی بھری نظروں سے میں نے ان سب کو دیکھ۔ ارمان ہو، جذبہ ہو یا زندگی کا کوئی مثبت مقصد ہو اور ساتھ ہی موقع بھی ہو تو اکاؤنٹ والے صاحب کے مطابق کل ٹوٹل جمع میزان ہو اور حاصل کے قومی امکانات ہوں تو نگاہوں کے سامنے قدرے روشنی رقص کرنے لگتی ہے۔ ایک عجیب سی روشنی بقول تسنیم فاروقی:

امید کی مدھم لو بھی ہو تو پیاری ہے
یہ ایک کرن تنہا ظلمات پہ بھاری ہے

ہم دونوں بھاگتے ہوئے کھلے میں آگئے۔ نشانہ صاف تھا، بیچ میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ اس مختصر سے لمحے میں اگر میں ناکام رہا تو کسی سیاسی رہنما کی طرح دوسروں کو الزام نہیں دے سکتا۔ نہ قسمت کو اور نہ ہی گلے

نواب واجد علی شاہ اختر لکھنوی
۱۸۲۲ ۱۸۸۷

غزل

اللہ اے بتو! ہمیں دکھلائے لکھنؤ
سوتے میں بھی یہ کہتے ہیں ہم ہائے لکھنؤ

ایسا ہوا ہوں ہجر میں اس کے نحیف و زار
دیکھے اگر مجھے وہیں شرمائے لکھنؤ

آئے نہ میرے پاس تو میں آپ ہی چلوں
مجھ کو خدا کرے کہیں بلوائے لکھنؤ

کلکتہ کے حسینوں کو جب دیکھ لیتا ہوں
اس وقت دل میں ہوتا ہے سودائے لکھنؤ

اب لٹ گیا ہے کیا رہا دوزخ سے بڑھ کے ہے
رشک بہشت کہتے تھے سب جائے لکھنؤ

خوش چشمی آہوؤں کی وہ بھولے جہان میں
دیکھے جو آنکھ نرگس شہلائے لکھنؤ

گلشن عجب بہار کہ ہر قصر رشک خلد
اور گومتی غضب کی ہے دریائے لکھنؤ

حور و پری کو رشک تھا اک ایک شخص پر
بے مثل تھے سبھی مہ سیمائے لکھنؤ

مرنے کے بعد بھی نہ مٹے گا جگر سے داغ
جنت میں ہم کو ہوئے گی پروائے لکھنؤ

جب سے ہٹا ہے یہ تہہ و بالا وہ ہوگیا
جنت کوئی ضرور تھا بالائے لکھنؤ

میں کیا کہوں فقیروں کو جو کچھ غرور تھا
اک اک گدائے شہر تھا دارائے لکھنؤ

ہٹتا نہیں تصور اسباب ملک و مال
کانوں میں بج رہی ہے وہ شہنائے لکھنؤ

کیا کیا حسیں تھے جمع پرستاں کا تختہ تھا
نظروں میں پھرتے ہیں رُخِ زیبائے لکھنؤ

شاہوں پہ فخر کرتے تھے اس ملک کے گدا
تھا مثل جام جم مئے و مینائے لکھنؤ

ہر چند لاکھ طرح بھلاتا ہوں یاد کو
اخترؔ پکار اٹھتا ہے دل ہائے لکھنؤ

بابل مورا، نیہر چھوٹو ہی جائے
بابل مورا، نیہر چھوٹو ہی جائے
چار کہار مل، موری ڈولیا سجاویں
مورا اپنا بیگانا چھوٹو جائے، بابل مورا
آنگنا تو پربت بھیوا اور دیہری بھئی بدیس
جائے بابل گھر آپنو میں چلی پیا کے دیس... بابل مورا...

چھوڑ چلے لکھنؤ نگری.....
کہیں حال.....
.....کہیں حال کہ
.....ہم پر کیا گزری
جب چھوڑ چلے لکھنؤ نگری

انگ بھبھوت جوگن بن ملیاں
چھان پھری سب گلیاں
میں تو شہزادے کو ڈھونڈھوں چلیاں
جی جاوت ہے ڈگر نہیں آوت
ہم محلوں کے بھیس بنا کے
دیس بدیس نکلیاں رے..... انگ بھبھوت

سقوط سلطنت اودھ کے بعد لکھنؤ کو نواب واجد علی شاہ نے مٹیا برج میں بالکل اسی طرح سے یاد کیا جیسے عہد مغلیہ کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر نے ملک بدر ہونے کے بعد مادر وطن کی یاد میں آنسو بہائے تھے 'کتنا ہے بدنصیب ظفر.....' نواب واجد علی شاہ ۱۸۵۶ء میں لکھنؤ اور اپنی سلطنت سے محروم ہو گئے۔ غریب الوطنی میں لکھنؤ کو یاد کرتے ہوئے نواب واجد علی شاہ نے جو غزل کہی وہ گزشتہ صفحہ پر پیش ہے۔

۳۰ جولائی ۱۸۲۲ء نواب واجد علی شاہ کی سالگرہ ہوتی ہے۔ ان کے ۱۹۵ ویں یوم ولادت کے موقع پر
ادارہ 'نیا دور' کی جانب سے ان کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے مذکورہ غزل کے علاوہ تین ٹھمریاں بھی شائع کی جا رہی ہیں۔

میں پڑے تعویذ یا مالا کو، دوری کم ہوتی گئی، دوڑتے ہوئے میں نے اپنا ہاتھ بڑھایا اور پیچھے سے اس کے کوٹ کا کالر پکڑ لیا.....مگر یہ کیا.....اس کے کوٹ کا پورا پچھلا حصہ میرے ہاتھ میں تھا۔ کپڑے کے ٹکڑے تو میرا مقصد نہیں تھے۔ یہ تو میرا نشانہ یعنی اس چور کا حصہ بھر ہیں جسے ہم چور نہیں کہہ سکتے، یہ ثبوت تھا کہ منزل پانے میں بھی کتنی دشواری ہے۔ کس قدر حیرت انگیز حالات سے دوچار ہو رہا تھا۔ کچھ اور قریب پہنچ کر میں اچھلا اور اس پر جا گرا۔ ایک پیر میں گرفت میں آ گیا مگر یہ کیا..... وہ مسکرایا، پلٹا اور میری جانب دیکھتے ہوئے اس نے ایک جھٹکا دے کر ٹانگ جسم سے الگ کر دی۔ میں سوچنے لگا، عجیب چور ہے، جسم کے جس حصے کو پکڑو، بس وہی میرے ہاتھ میں رہ جاتا ہے۔ ایک ٹانگ اکھڑ چکی تھی پھر بھی وہ بھاگے جا رہا تھا۔ دور مجھ سے دور۔ اکھڑنے کے بعد اس ٹانگ کو بھی چور نہیں کہا جا سکتا ہے۔ نشانہ (Target) کا ایک حصہ کبھی بھی پورے نشانہ کے حصولی کی تسلی نہیں دے سکتا۔ جانتا ہوں، نشانہ زندہ ہونا چاہئے۔ چور کا پیچھا کرنے کا نشانہ لے کر دوڑتے ہوئے میں اس کی اکھڑی ہوئی ٹانگ پر کہاں رکنے والا تھا۔

لنگڑا ہی سہی، نشانہ پھر بھی نشانہ ہی تھا جو کہ بھاگا جا رہا تھا۔ میں زندہ حصہ کی طرف پھر لپکا، چور کی بدلتی کیفیت نے مجھے کامیابی کی لذت سے شرابور کر دیا تھا۔ میرے اندر تجسس کی لطیف کیفیت جنم لے چکی تھی۔ میں نے ایک ایک کر کے اس کی باقی بچی ایک ٹانگ اور دونوں ہاتھ اکھاڑ لئے۔ اپنی دوڑ میں مزید تیزی پیدا کی اور پھر وہ وقت آیا جب میرا نشانہ صرف ایک دھڑ، بقیہ جسم اور اس پر رکھا ہوا ایک عدد سر تھا۔

کہتے ہیں مقصد حاصل کرنے کا آخری سرا جب کافی آسان ہو جائے تب وہ مسرت یا یاس و حسرتوں سے بھرپور ہوجاتا ہے جن کے سامنے آپ نے دوڑ شروع کی تھی۔ وہ سب کے سب بہت دور کہیں کوسوں پیچھے چھوٹ گئے تھے۔ یہی میرے ساتھ بھی ہوا۔ جب میں اچھل کر اس کے نصف فیصد دھڑ اور سر پر گرا، اسے پوری طرح اپنے قبضے میں لے لیا لیکن ہائے افسوس کہ تب وہاں میرے اس معرکے کو، میری خوشی کو اور میری اس شاندار کامیابی کو دیکھنے والا کوئی نہ تھا۔ منزل میرے سامنے تھی، کامیابی سے میرا دامن بھرا ہوا تھا لیکن میری اس لازوال کامیابی کو دیکھ کر خوش ہونے والے یا پھر تالیاں بجا کر داد و تحسین سے نوازنے والوں کا فقدان تھا۔

پلک جھپکتے ہی سر بھی چھٹپٹا کر دھڑ سے الگ ہو

کہتے ہیں مقصد حاصل کرنے کا آخری سرا جب کافی آسان ہو جائے تب وہ مسرت یا یاس و حسرتس سے بھرپور ہوجاتا ہے جن کے سامنے آپ نے دوڑ شروع کی تھی۔ وہ سب کے سب بہت دور کہیں کوسوں پیچھے چھوٹ گئے تھے۔ یہی میرے ساتھ بھی ہوا۔ جب میں اچھل کر اس کے نصف فیصد دھڑ اور سر پر گرا، اسے پوری طرح اپنے قبضے میں لے لیا لیکن ہائے افسوس کہ تب وہاں میرے اس معرکے کو، میری خوشی کو اور میری اس شاندار کامیابی کو دیکھنے والا کوئی نہ تھا۔
منزل میرے سامنے تھی، کامیابی سے میرا دامن بھرا ہوا تھا لیکن میری اس لازوال کامیابی کو دیکھ کر خوش ہونے والے یا پھر تالیاں بجا کر داد و تحسین سے نوازنے والوں کا فقدان تھا۔

گیا۔ طے کرنا تھا کہ نشانے کا آخری سرا کون سا ہے۔ دھڑ بھاری تھا، اسے اٹھا کر مال تک لے جانا مشکل ہی نہیں دشوار تھا۔ چہرہ ہی آدمی کی شناخت ہوتا ہے۔ فیصلے کے لئے مجھے یاد آیا۔ میں نے اسے اٹھا لیا۔ اس حیرت انگیز چور کے سر کو اپنے ہاتھوں میں لئے چل پڑا۔ ان لوگوں کو بتانے کے لئے جو دعویٰ کرتے تھے میں ٹکڑے خور ہوں اور میری زندگی کا مقصد صرف اور صرف صفر ہے۔

مال کا دروازہ، دکھائی دے رہا تھا۔ چور کو پکڑنا میرا عظیم کارنامہ تھا۔ چور کا سر ہاتھوں میں تھامے میں آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ میرے اس عظیم کارنامہ کے باوجود مال کے دروازہ پر کوئی ہلچل نہیں تھی۔ پھر ٹھیک دروازے پر پہنچتے ہی کوئی ہلچل پیدا ہوئی، لوگ مجھے دیکھ کر حیرت سے پیچھے ہٹنے لگے تھے۔ یہ کامیاب آدمی کے کارنامے کا کیسا حیرتی منظر ہے، مجھے گھیر کر شاباشی دینے کے بجائے لوگ راستہ چھوڑ رہے تھے۔ میں سوچنے لگا۔

پھر میں نے ایک نظر اپنی کامیابی یعنی اس چور کے سر پر ڈالی۔ جانے کب۔ میری مالا نکل کر اس چور کے گلے میں پہنچ گئی۔ وہ کون سا لمحہ تھا جب مقصد حاصل کرنے کی کوشش میں یہ تبدیلی عمل میں آئی تھی۔

مالا وہاں کیسے پہنچی؟ منزل پانے کے بعد کچھ پہیلیاں ان سلجھی کیوں رہ جاتی ہیں؟ یہی سوچتے ہوئے میں ہال کے ریسپشن (Reception) پر پہنچا۔ کافی لوگ جمع تھے وہاں۔ ان میں کئی ایسے تھے، جنہوں نے اگر ساتھ دیا تو میں منزل تک بہت پہلے پہنچ جاتا۔ تب وہ سب کامیابی میں میرے حصہ دار ہوتے، مگر اب وہ سب میرے تماشائی تھے۔ صرف تماشائی لیکن سب کے سب حیرت زدہ تھے اتنے زیادہ کہ میری اس کامیابی پر تالیاں بجانا تک بھول گئے تھے۔ میں ان کے بیچ جا کھڑا ہوا ایک کامیاب مسکراہٹ لئے ہوئے۔ میں پسینے میں شرابور ہانپ رہا تھا لیکن اچانک شور شروع ہوا۔ آپس میں کچھ کہا سنا جانے لگا۔ اسی وقت قریب کے آفس کا دروازہ کھلا اور وہ لوگ نمودار ہوئے جو اس عالیشان مال کے لئے کل ٹوٹل جمع میزان کرتے آئے ہیں یا جو مالکان کے دیدار کرتے رہنے کی وجہ سے قابل احترام ہیں۔

ان ہی میں سے ایک نے منظر کا معائنہ کرتے ہوئے حیرت سے میری جانب قدم بڑھا کر سوال کیا۔ کیوں جناب یہ کیا تماشا ہے، اپنے ہاتھ میں اپنا ہی سر لے کر گھومنے کا کیا تک ہے۔

❑❑❑

آگ کے جگنو

حمیراء عالیہ
ندوہ کیمپس، ٹیگور مارگ، لکھنؤ
موبائل: 8090905885

صبح ہونے والی تھی۔حنین نے کھڑکی کے ٹوٹے ہوئے کانچ سے باہر دیکھا۔دور دھوئیں کی بھاری چادر کے پیچھے سورج کی ہلکی سی سرخی نظر آرہی تھی۔اس نے چاروں طرف ایک طائرانہ نظر ڈالی۔فضا میں ہر طرف ہلکا ہلکا دھواں پھیلا ہوا تھا۔ پورے ماحول میں ایک عجیب سا سناٹا طاری تھا۔نہ کسی چڑیا کی چہچہاہٹ.....نہ کسی آدم زاد کی آواز۔ورنہ پہلے تو فجر کے وقت خوب رونق ہوا کرتی تھی۔اس نے گردن جھکا کے نیچے جھانکا۔شاید ماما آرہی ہوں۔گلی کے کونے پر کوڑے اور ملبے کے ڈھیر پر ایک بلی اپنے پنجوں سے نجانے کیا کھود رہی تھی۔ اس کے سامنے مسجد کے آدھے سلامت حصے سے دو عمر رسیدہ بوڑھے باہر نکل رہے تھے۔حنین انہیں پہچانتی تھی۔ان میں سے ایک کی چپس کی دکان تھی۔روز صبح اسکول جاتے ہوئے حنین اس سے چپس کا ایک پیکٹ خریدتی تھی۔اس بوڑھے کے پاس چپس کی بہت ورائٹی ہوتی تھی۔لیکن حنین ہمیشہ ادرک کے ذائقے والا چپس خریدتی تھی۔اس کا نام شاید ابوعمر تھا۔وہ اسے دیکھتے ہی مسکراتے ہوئے اس کا چپس پہلے سے ہی اٹھا لیتا تھا۔اسے بے اختیار اپنا فیورٹ یاد آ گیا۔

دوسرا شخص محمد تھا۔وہ پتہ نہیں کیا کرتا تھا۔حنین نے اسے ہمیشہ پھولوں والی دکان کے پاس کرسی پر بیٹھے ہوئے دیکھا تھا۔ان دونوں کے علاوہ مسجد سے کوئی بھی نہ نکلا۔اور اب اس علاقے میں بچا بھی کون تھا۔عمر رسیدہ بوڑھے جو اپنی مرضی سے یا معذوری کے سبب یہاں رکے تھے یا پھر بیوہ عورتیں اور یتیم بچے جن کا کوئی سہارا نہ تھا۔ورنہ پورا محلہ دھیرے دھیرے خاموشی سے یہاں سے نکل گیا تھا۔مشرقی حلب کے اس حصے میں باغیوں کا مکمل قبضہ تھا۔انہوں نے اسد حکومت کے حامیوں کو چن چن کر مار دیا تھا۔اور خوف کی وجہ سے باقی لوگ کتوں کی سی زندگی جینے پر مجبور ہو گئے تھے۔پھر ایک دن ان کی مدد کے لئے فوج آئی اور جو رہا سہا سکون تھا وہ بھی ختم ہو گیا۔ زندگی مکمل عذاب بن گئی۔جس دن پہلا حملہ ہوا تھا حنین نے اس دن آسمان پر بڑے بڑے ہیلی کاپٹر اور ڈرون اڑتے دیکھے تھے۔لیکن وہ ڈری نہیں تھی۔ وہ تب بھی کھڑکی سے جھانک کر آسمان سے گرتے بموں کو دیکھ رہی تھی پھر اچانک ماما نے اسے زور سے کھینچا تھا اور کھڑکی بند کر دی تھی۔انہوں نے حنین سمیت دونوں لڑکوں کو اپنی گود میں چھپا لیا تھا۔باہر بہت شور ہو رہا تھا اور ہر دھماکے کے ساتھ انہیں اپنا گھر ہلتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔پھر گولیاں بھی چلنے لگی تھیں اور اسی حملے میں ان کی کھڑکیوں کے کانچ ٹوٹے تھے۔

اگلی صبح حنین جب باہر گئی تو سارا منظر بدلا ہوا تھا۔مسجد آدھی شہید ہو گئی تھی اور اس کے پیچھے ڈاکٹر علی کا گھر اور اس لائن کی ساری عمارتیں پوری طرح سے تباہ ہو چکی تھیں۔ابوعمر کی چپس کی دکان، اس کے آگے پاشا کی مٹھائی کی دکان، پھر جنرل اسٹور اور کھلونوں کی دکان سب کچھ ختم ہو چکا تھا۔خود اس کا گھر جس بلڈنگ میں تھا وہ بائیں طرف سے ترچھی ہو کر ٹوٹی تھی۔تاحد نظر تباہ شدہ عمارتیں اور ان کا ملبہ بکھرا ہوا تھا۔

کہیں کہیں اکا دکا عمارتیں بچی تھیں ان میں اس کا اسکول بھی شامل تھا۔اسے خوشی ہوئی چلو اسکول تو بچ گیا۔لیکن پھر وہ اداس ہو گئی۔اسکول جانے والے اب کہاں بچے تھے۔وہ یونہی بڑھتی جا رہی تھی جب کسی نے اسے آواز دی تھی۔

اگلی صبح حنین جب باہر گئی تو سارا منظر بدلا ہوا تھا۔مسجد آدھی شہید ہو گئی تھی اور اس کے پیچھے ڈاکٹر علی کا گھر اور اس لائن کی ساری عمارتیں پوری طرح سے تباہ ہو چکی تھیں۔ابوعمر کی چپس کی دکان، اس کے آگے پاشا کی مٹھائی کی دکان، پھر جنرل اسٹور اور کھلونوں کی دکان سب کچھ ختم ہو چکا تھا۔خود اس کا گھر جس بلڈنگ میں تھا وہ بائیں طرف سے ترچھی ہو کر ٹوٹی تھی۔تاحد نظر تباہ شدہ عمارتیں اور ان کا ملبہ بکھرا ہوا تھا۔کہیں کہیں اکا دکا عمارتیں بچی تھیں ان میں اس کا اسکول بھی شامل تھا۔اسے خوشی ہوئی چلو اسکول تو بچ گیا۔لیکن پھر وہ اداس ہو گئی۔اسکول جانے والے اب کہاں بچے تھے۔وہ یونہی بڑھتی جا رہی تھی جب کسی نے اسے آواز دی تھی۔

''حنین، حنہ، اختی الکریمہ.....!!'' اس نے آواز کی سمت نظریں گھمائیں تو سعود اور عائشہ کو زخمی حالت میں پایا۔ان کا گھر بھی آدھا مسمار ہو چکا تھا۔وہ دوڑ کر ان کے پاس گئی۔

''حنہ، رات کو بابا واپس نہیں آئے تھے، ماما ان کو تلاش کرنے گئی تھیں پھر وہ بھی نہیں آئیں'' دونوں

بچے رونے لگے۔سعود تو ٹھیک تھا لیکن عائشہ کے بازو سے خون نکل رہا تھا۔وہ دونوں بچے اس کے اسکول میں جونیئر کلاس میں تھے۔

''جب تک وہ واپس نہیں آتے تم لوگ ہمارے گھر میں رہ سکتے ہو''۔حنین نے سعود کو گود میں اٹھالیا۔

وہ ان دونوں کو لے کر گھر آئی تو ماما نے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔وہ تو سوچ رہی تھی کہ ماما خوش ہونگی اور اس کی تعریف کرینگی لیکن شاید ختم ہوتے کھانے نے انہیں بھی خوفزدہ کر دیا تھا۔

اس واقعے کو ایک سال گزر گیا تھا اور اس ایک برس میں حنین نے جانا کہ عروج سے زوال کا سفر کیسا ہوتا ہے۔زندگی کا اصلی چہرہ کتنا بھیانک ہے۔اس ایک سال میں پہلے دوائیں ختم ہوئی تھیں پھر پیسے پھر کھانا اور سب سے آخر میں پانی۔ان کے گھر سے قریبی ہاسپٹل پوری طرح سے تباہ ہو چکا تھا اور دوسرا ہاسپٹل تقریباً ۶ کلو میٹر دور تھا۔حنین نے اپنی آنکھوں کے سامنے سعود اور اپنے لاڈلے چھوٹے بھائی حمزہ کو نمونیا سے مرتے دیکھا تھا۔سخت سردی میں مناسب خوراک اور دوا کی کمی کی وجہ سے ان دونوں بچوں نے بڑی کسمپرسی میں دم توڑ دیا تھا۔اب گھر میں چار افراد بچے تھے۔ماما،ابراہیم،عائشہ اور وہ خود۔زندگی بد سے بدتر ہوتی جارہی تھی۔اسے یاد نہیں تھا کہ آخری بار اس نے کب پیٹ بھر کر کھانا کھایا تھا۔گھر کا راشن دھیرے دھیرے ختم ہو گیا تھا۔اور تب سے اب تک تقریباً سارا قیمتی سامان بک چکا تھا۔ماما کسی نہ کسی طرح ان سب کے لئے کھانا لے ہی آتی تھیں لیکن مہنگائی کی وجہ سے وہ اتنا تھوڑا ہوتا تھا کہ بمشکل ان سب کی بھوک ختم ہو پاتی تھی،پھر ایک دن فوج نے ان کے علاقے کی پانی کی سپلائی بھی بند کر دی تھی تاکہ باغی گھبرا جائیں لیکن ان کے بجائے عام شہریوں کا جینا مشکل ہو گیا۔وہ لوگ پینے کے صاف پانی کو ترس گئے تھے۔تب ایک دن تنگ آ کر اس نے ماما سے روتے ہوئے ضد کی تھی:

''مجھے یہاں نہیں رہنا،میں تنگ آ گئی ہوں ماما،ہم لوگ دوسرے لوگوں کی طرح یہاں سے کیوں نہیں نکل جاتے؟''ماما کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا۔

''اب ہم یہاں سے نہیں نکل سکتے حنہ!باغیوں نے شہر کے چاروں طرف زمین دوز بارود کا جال بچھا دیا ہے۔ہم لوگ ایک پنجرے میں قید ہو گئے ہیں''۔

''تو ہم لوگ مر کیوں نہیں جاتے''؟۔وہ زور سے چیخی تھی۔''اس طرح سے ہم لوگوں کو زندہ رکھ کے اللہ کو کیا فائدہ ہو رہا ہے؟''

''حنہ!'' ماما نے اک زور کا تھپڑ اسے مارا۔''چند دنوں کی بھوک اور پیاس نے تمہیں اپنے خدا سے بدگمان کر دیا۔افسوس!!!''''چند دن؟؟''وہ غصے اور بھوک سے پاگل ہو رہی تھی۔''گزشتہ تین دن سے ہم لوگوں نے صرف دو بار کھانا کھایا ہے اور پانی بھی بس چند گھونٹ۔آپ کو عائشہ نظر نہیں آتی؟؟آپ کو ابراہیم نظر نہیں آتا؟؟جب سے جنگ شروع ہوئی ہے میں راتوں کو سو نہیں پاتی۔مجھے ڈر لگتا ہے اگر میں سوئی تو بے خبری میں ہی مر جاونگی۔''

''حنین''ماما نے اسے ایکدم سے بھینچ لیا''کل صبح ہوتے ہی میں پانی کی تلاش میں جاؤنگی چاہے مجھے کتنی ہی دور کیوں نہ جانا پڑے۔تم ابراہیم اور عائشہ کا خیال رکھنا''اگلی صبح ماما نے اٹھ کر ان سب کو آدھی آدھی خبز کا ناشتہ کروایا اور حنین کو تاکید کر کے نکل گئیں۔

صبح سے دوپہر ہوئی۔دوپہر سے شام۔ماما واپس نہیں آئیں۔حنین کو رونا آنے لگا۔اسے خود پر غصہ آ رہا تھا۔کیا تھا اگر وہ ماما سے یوں ضد نہ کرتی۔مرنا تو تھا ہی کل نہیں تو آج ہی پیاس سے مر جاتی لیکن ماما کے ساتھ تو رہتی۔پتہ نہیں وہ کہاں پریشان ہو رہی ہونگی۔وہ مسلسل کھڑکی سے ٹنگی ہوئی تھی۔بیچ میں کئی بار ابراہیم اور عائشہ نے پیاس اور بھوک کی ضد کی لیکن اس نے کسی نہ کسی طرح بہلا ہی لیا۔

رات ہو گئی تھی۔وہ اب بھی کھڑکی سے ہٹی نہیں تھی۔پھر اچانک اس نے ایک خوفناک منظر دیکھا۔جس طرف ماما گئی تھیں اس طرف جنگی ہیلی کاپٹر آ رہے تھے اور کچھ ہی دیر بعد دھماکوں سے فضا لرزنے لگی۔ابراہیم اور عائشہ خوف سے رونے لگے تو اس نے ان دونوں کے کانوں میں کس کے کپڑا باندھ دیا اور دونوں کو کمبل اوڑھا کے لٹا دیا۔وہ پھر کھڑکی پر آ گئی۔رہ رہ کے آگ کے شعلے بلند ہو رہے تھے۔اندھیرے میں جب دھماکے سے چنگاریاں اڑتیں تو چاروں طرف روشنی سی ہو جاتی۔جیسے ڈھیر سارے جگنو.....لیکن نہیں.....جگنو تو بہت پیارے ہوتے ہیں۔وہ کسی کو نقصان نہیں پہنچاتے۔وہ تو پرسکون راتوں میں آتے ہیں.....ٹھنڈی ٹھنڈی روشنی لے کر.....یہ تو آگ کے پرندے ہیں.....اگر پکڑنے کی کوشش کی تو ہاتھ جل جائیں۔اسے یاد آیا جب اس کے علاقے میں پہلا حملہ ہوا تھا تب اگلے دن اس نے ایک بلی کو دیکھا تھا وہ مری ہوئی تھی اور پوری سیاہ ہو گئی تھی۔شاید وہ جل گئی تھی۔تو کیا ماما بھی جل گئی ہونگیں اور اس بلی کی طرح کہیں پڑی ہوئی ہونگیں؟؟اس کے گالوں پر آنسو بہنے لگے اور وہ خاموشی سے رونے لگی۔

''لیکن ماما بلی تھوڑی نا ہیں۔ضرور ان کو کسی نے بچا لیا ہوگا''۔اس کے ننھے سے دل نے اسے تسلی دینے کی ناکام سی کوشش کی۔''اللہ کریم!ماما کو صحیح سلامت بھیج دیجئے پھر میں کبھی ان سے ضد نہیں کرونگی''وہ ابراہیم اور عائشہ کو دیکھتے ہوئے چپکے چپکے دعا کر رہی تھی۔لیکن ماما واپس نہیں آئیں۔صبح آنکھ کھلتے ہی دونوں بچے بھوک اور خوف سے رونے لگے۔اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیسے ان کو چپ کرائے۔پھر اس نے ایک فیصلہ کر لیا۔جب ماما بابا کو کبھی واپس نہیں آنا اور اس گھر میں نہ کھانا ہے پانی تو پھر یہاں رہنے کا کیا فائدہ.....وہ جانتی تھی کہ ترکی کا بارڈر یہاں سے قریب تھا۔اس نے اپنے اسکول بیگ میں اپنی سمجھ سے چھوٹا موٹا سامان رکھا اور

دونوں بچوں سے جوتے پہننے کے لئے کہا۔

''لیکن حنہ، ہم کہاں جارہے ہیں؟'' ابراہیم نے سوال کیا۔ ''ہم لوگ یہاں سے ترکی جارہے ہیں۔ شاید وہاں صاف پانی اور کھانا مل جائے ہمیں''

''سچی!!'' دونوں خوش ہوگئے۔

''ہاں! چلو چلتے ہیں''، اس نے دونوں کی انگلی پکڑی دروازے پر لاک لگایا اور نکل گئی۔

سڑک پر ایک پندرہ سالہ لڑکی اور آٹھ سالہ دو بچوں کو جاتے دیکھ کر کسی نے حیرت کا اظہار نہیں کیا۔ اب تک ہزاروں بچے لاوارث اور یتیم ہو چکے تھے۔ اب تو یہ عام بات ہوگئی ہے۔ چلتے چلتے وہ لوگ اپنے علاقے سے کافی دور نکل آئے تھے جب حنین نے دور سے ایک شخص کو آتے دیکھا اس کے پاس دو بڑے ڈبوں میں پانی تھا۔ شاید وہ کہیں اور سے پانی لے کر آرہا تھا۔ وہ بے اختیار اس کی طرف دوڑی۔

''ہم لوگ کل سے پیاسے ہیں۔ پلیز تھوڑا سا پانی دے دو'' اس نے نہایت عاجزی سے اس سے درخواست کی۔

اس شخص نے ان تینوں پر نگاہ ڈالی۔ سوکھے ہونٹ، زرد چہرے، میلے کپڑے اور گرد آلود چہرہ۔ یقینا وہ بچے لمبی مسافت طے کر کے آئے تھے۔ اس نے ڈبہ کھولا اور ڈھکن میں تینوں کو باری باری پانی پلایا۔ پھر اس نے اپنے پاس سے ان کو ایک سیب بھی دیا۔

''تم لوگ کدھر جارہے ہو؟'' اس نے سیب پکڑاتے ہوئے سوال کیا۔ ''ہم لوگ ترکی جارہے ہیں''، حنہ نے نہایت بردباری سے جواب دیا۔

''تمہیں پتہ ہے ترکی کا راستہ کدھر ہے اور وہاں تک کیسے جانا ہے؟'' وہ حیرت زدہ تھا۔

''نہیں! مجھے نہیں معلوم مگر میں یہ جانتی ہوں کہ ترکی میں ہم محفوظ رہیں گے اور وہاں ہمیں ڈھیر ساری خبز اور لبن ملے گا''۔ وہ نہایت سنجیدگی سے جواب دے رہی تھی۔

''اختی! کیا وہاں قطائف بھی ملیں گے؟''

عائشہ نے للچائے ہوئے انداز میں سوال کیا۔

''ہاں عائشہ! قطائف بھی اور بسبوسہ بھی''۔ ''اور مجھے حلاوۃ الجبن بھی کھانا ہے حنہ''، ابراہیم اس کا کندھا ہلاتے ہوئے بولا۔ وہ شخص خاموشی سے ان کی باتیں سن رہا تھا۔ پھر اس نے حنین کو اپنی طرف آنے کا اشارہ کیا۔

''میری بات سنو امّورۃ'' (شہزادی) وہ اسے ذرا پرے لے جا کر بولا ''آج رات ایک اسٹیمر اردن جانے والا ہے لیکن اس کے لئے تمہیں شمال کی جانب جانا ہوگا۔ اور غور سے سن لو یہاں سے مزید آگے جانے پر تمہیں موت کے سوا کچھ بھی حاصل نہیں ہوگا

کیونکہ سرحد کے پاس بارودی سرنگیں بچھی ہوئی ہیں اور آج رات سنا ہے فوج کا حملہ ہونے والا ہے۔'' اس کا ننھا سا دل دھڑکنے لگا اور پیشانی پر پسینہ آ گیا۔

''لیکن میں تمہیں روکوں گا نہیں، کیونکہ یہاں رہ کے بھی تم لوگ کیسی زندگی گزارو گے مجھے بہتر اندازہ ہے۔ میں تمہاری ہمت کو سلام کرتا ہوں۔ اللہ تمہارا حافظ و ناصر ہو''۔

وہ اسے دور جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ اس شخص کی آواز اب بھی اس کے کانوں میں گونج رہی تھی اس سے ہلا بھی نہیں جارہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کے قدم جم گئے ہوں۔

''حنہ..... حنہ!! جلدی چلو کھڑی کیوں ہوں؟''۔ حنین نے دیکھا دونوں بچوں کے چہرے خوشی سے سرخ ہورہے تھے بہترین کھانا ملنے کی خوشی..... پسندیدہ مٹھائیاں ملنے کی خوشی..... اس موت کے کنوئیں سے نکلنے کی خوشی۔ کاش وہ لوگ اتنی ہی آسانی سے یہاں سے نکل سکتے پھر چاہے ترکی ہو یا اردن کچھ فرق نہیں پڑتا جو بھی جگہ ہوگی اس جلتے جہنم سے تو بہتر ہی ہوگی۔ اس نے گہری سانس لی اور دونوں کا ہاتھ تھام کر چل پڑی اس شخص کے بتائے ہوئے راستے پر وہ حتی الامکان دوسروں کی نظروں سے بچتے ہوئے سفر کر رہی تھی۔ شام گہری ہونے لگی تھی جب ابراہیم چلتے چلتے گر پڑا۔

''میں اب اور نہیں چل سکتا''، وہ رونے لگا ''مجھے بہت بھوک لگی ہے''۔

''اختی! میں بھی نہیں چل سکتی'' عائشہ کی آواز بھی تھرتھرا رہی تھی لیکن وہ خود پر قابو کر رہی تھی۔

''ابراہیم، میرے بھائی'' اس نے اور عائشہ نے بمشکل اسے سہارا دیا۔

''میں تمہیں گود میں نہیں اٹھا سکتی''۔ بے بسی سے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''ابھی اور کتنی دور جانا ہے حنہ؟'' وہ اس کے سوال پر خاموش ہوگئی۔ اس بات سے تو وہ خود بھی لاعلم تھی۔ بہرحال اتنا اندازہ تو تھا کہ ابھی اسے کافی دور جانا ہے۔ لیکن یہ بات ابراہیم سے کہہ کر وہ اس کا حوصلہ پست نہیں کرنا چاہ رہی تھی۔ تبھی اچانک وہ چونکی۔ دور کہیں سے شاید کسی گاڑی کے انجن کی آواز آرہی تھی۔ وہ دونوں کو چھوڑ کر کچھ فاصلے پر گرے ہوئے ایک مکان کے ملبے پر چڑھ کر آواز کی سمت دیکھنے لگی۔

دور بہت دور سے بے شمار فوجی بکتر بند گاڑیاں اور ٹینک آرہے تھے۔ ان پر لہراتے سیاہ جھنڈوں سے وہ انہیں آسانی سے پہچان سکتی

تھی۔ ''تو کیا یہاں پر لڑائی ہونے والی ہے؟'' اس کا دل بند ہونے لگا۔ وہ دوڑ کر واپس ان دونوں کے پاس آئی۔

''ابراہیم ،عائشہ!..... اٹھو جلدی۔ ہمیں یہاں سے جانا ہوگا'' وہ ان دونوں کو گھسیٹنے لگی۔

''کہاں لے جارہی ہو حنہ؟'' ابراہیم بہت مشکل سے چل پا رہا تھا'' مجھے اب ترکی کے علاوہ کہیں نہیں جانا''۔

وہ خاموش رہی اس کے پاس ان دونوں بچوں کے سوالوں کا کوئی جواب نہیں تھا کسی طرح بمشکل گھسیٹتے ہوئے وہ انہیں سڑک سے ہٹا کر عمارتوں کی طرف لے آئی۔ اور تب اس نے محسوس کیا۔ پورا علاقہ تقریباً خالی تھا۔ شاید ان لوگوں کو اس حملے کا احساس ہوگیا تھا یا پھر اس علاقے کے لوگ پہلے ہی بستی چھوڑ کر جا چکے تھے۔ ایک تباہ شدہ بلڈنگ کے پیچھے بنے چھوٹے سے میدانی حصے پر اس نے ابراہیم کو لٹا دیا۔ عائشہ بھی اس کے قریب ہی لڑھک گئی۔

''عائشہ!'' اس نے ہولے سے اسے چھوا'' تم نے کبھی ٹوٹتا تارا دیکھا ہے؟''۔ اس کی بات پر عائشہ نے دھیرے سے نفی میں سر ہلایا۔

''تم نے دیکھا ہے ابراہیم؟'' اس نے ابراہیم کی پیشانی سہلائی۔

''نہیں! میں نے بھی نہیں دیکھا۔ کیا وہ بہت خوبصورت ہوتا ہے؟''

''ہاں! بہت خوبصورت'' اس نے دونوں کو قریب کرلیا'' تمہیں پتہ ہے جب تارا ٹوٹتا ہے تو بہت زور کی آواز ہوتی ہے لیکن تم لوگ ڈرنا نہیں۔ کیونکہ وہ بہت بڑا ہوتا ہے نا اس لئے''۔ وہ بہت پیار سے ان دونوں کو سمجھا رہی تھی۔

''پھر پتہ ہے پورے آسمان میں خوب ساری روشنی ہوجاتی ہے''، دور کہیں سے جنگی ہیلی کاپٹر کی ہیبت ناک آواز نزدیک آنے لگی تھی۔

''پھر کیا ہوتا ہے اختی؟'' عائشہ نے اس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا۔

''پھر جب تارا ٹوٹ کر نیچے گرتا ہے تو بہت سے آگ کے پرندے اسے دیکھنے کے لئے نکل پڑتے ہیں''۔ حنین نے آنکھیں بند لیں۔ اسے کل کی شام یاد آگئی تھی جب وہ کھڑکی پر کھڑی دور کہیں اور ہوتے ائیر اسٹرائیک دیکھ رہی تھی۔ آج وہ خود War Zone میں پھنس گئی تھی تو شاید کہیں اور سے کوئی دوسری حنین آگ کے پرندے دیکھے گی۔

''آگ کے پرندے کیسے ہوتے ہیں حنہ؟'' ابراہیم نے سوال کیا۔

''وہ دور سے بہت خوبصورت لگتے ہیں، لیکن جب بلیاں انہیں پکڑنے کی کوشش کرتی ہیں تو سیاہ ہوجاتی ہیں۔''

''کیا وہ جل جاتی ہیں اختی؟'' عائشہ خوفزدہ ہوگئی۔

''ہاں شاید، انہیں بس دور سے دیکھنا چاہئے''

ٹینک قریب سے گزر رہے تھے اوپر ائیر اسٹرائیک کرنے والے طیارے آگئے تھے۔ شاید ملٹری کو علم ہوگیا تھا کہ دہشت گرد اس علاقے سے گزرنے والے ہیں۔

لڑائی شروع ہوگئی تھی۔ وہ ان دونوں کے بیچ میں لیٹ گئی اور انہیں اپنے دائیں بائیں لپٹا لیا۔

''عائشہ، ابراہیم! دیکھو تارے ٹوٹ رہے ہیں''۔ اس نے آسمان کی طرف اشارہ کیا جہاں کی فضا دھماکوں سے روشن ہو رہی تھی۔ اور کہیں قریب ہی سے آگ کے شعلے بلند ہو رہے تھے۔

''حنہ! دیکھو..... آگ کے پرندے''

ابراہیم نے چنگاریوں کی طرف اشارہ کیا۔

''ہاں.....دیکھو کتنے خوبصورت ہیں نا۔ بس دعا کرو یہ ہمارے نزدیک نہ آئیں''۔

شور رفتہ رفتہ نزدیک آرہا تھا۔ گرمی بہت بڑھ گئی تھی اس نے بچوں کے کان پر بندھے کپڑے کو ٹائٹ کیا اور باری باری دونوں کو بوسہ دیا۔

''چلو ہم لوگ سونے کی کوشش کرتے ہیں..... ورنہ کہیں ان پرندوں نے ہمیں دیکھ لیا تو ہم بھی بلیوں کی طرح سیاہ نہ ہوجائیں''۔ اس نے انہیں اپنے بازوؤں میں چھپا لیا اور آنکھیں بند کرلیں۔

صبح میڈیا حملے سے ہونے والے نقصان کی کوریج کے لئے موجود تھا۔ گزشتہ رات کی شدید لڑائی نے کئی میل تک کی عمارتوں کو تباہ کردیا تھا۔ جلی ہوئی سیاہ عمارتیں جو دور سے ماتم کرتی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں۔ تبھی ایک کیمرہ مین کی نظر اس چھوٹے سے ہاتھ پر پڑی جو ایک عمارت کے ملبے سے جھانک رہا تھا۔ وہ بے ساختہ چیخا:

''ہیلپ ہیلپ!! I found some bodies here''۔

میڈیا کا سارا عملہ آنا فانا جمع ہوگیا۔ نہایت احتیاط سے ان تینوں کو ملبے سے نکالا گیا۔ ان سب کے چہرے حیرت انگیز طور پر جلنے سے بچ گئے بقیہ پورا بدن سیاہ ہوگیا تھا۔ تبھی کیمرہ مین کی نگاہ اس کاغذ پر پڑی جو حنین کی مٹھی میں دبا ہوا تھا اور تقریباً پورا جل چکا تھا۔ اس نے بڑی مشکل سے اس کے جلے ہوئے ہاتھ سے وہ جلا ہوا کاغذ نکالا اور کپکپاتے ہوئے اس میں لکھی تحریر پڑھی جو جلنے سے دھندلا گئی تھی۔

''اگر ہم جل جائیں تو ہمیں بلیوں کی طرح مت چھوڑنا''

حنین، عائشہ، ابراہیم۔

لوگ اظہار افسوس کر رہے تھے۔ دھڑا دھڑ تصاویر لی جارہی تھیں۔ وہ سب اسد حکومت اور داعش کو گالیاں دے رہے تھے۔ انٹرنیٹ پر تصویریں وائرل ہونے لگی تھیں۔ اوپر آسمان میں اب بھی دھواں پھیلا ہوا تھا..... اور نیچے زمین پر تین تارے گرے ہوئے تھے جو جل جل کر بجھ گئے تھے۔

❑❑❑

فن رقص و موسیقی مصوری و خطاطی

مرزا جعفر حسین
۱۸۹۹ ۱۹۸۹

موسیقی ہندوستان کا وہ فن ہے جس کا کوئی جواب دنیا کا کوئی ملک کبھی پیش نہیں کر سکا۔ مسلمانوں نے یہاں آ کر زندگی کے ہر شعبہ کو متاثر کیا اور ایک مخلوط کلچر کی بنیاد ڈال کر اس خوش نما گلدستہ کو تیار کیا لیکن موسیقی میں کوئی مداخلت نہیں کر سکے۔ اس فن کو جس طرح یہاں رائج تھا، قبول کر لیا اور اسی میں صنعت گری سے گلکاریاں کر کے اسی کو اور نکھار دیا البتہ ایک جدید طرز کا اضافہ ضرور کیا اور اس طرز کو ہم قوالی کہتے ہیں۔ موسیقی کی یہ صنف عراقی موسیقی کی نقل تھی۔ پڑھ بھی ہندوستان میں آ کر وہ بھی ہمارے ہی فن میں رنگ گئی اور اب ہم بجا طور سے اس کو بھی ہندوستانی موسیقی کہہ سکتے ہیں البتہ فرق یہ ہے کہ قوالی کو صوفیائے کرام کی سرپرستی کی بدولت فروغ حاصل ہوا تھا۔ ان کے نزدیک قوالی طرزِ غنا کی تعریف میں نہیں آتی تھی اس لئے اس کے اوپر حرمت غنا کا اطلاق بھی نہیں ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ چونکہ قوالی کے اشعار کا موضوع ہمیشہ حمد و نعت و منقبت تک محدود رہا اس لئے ان بزرگان دین کے لئے موسیقی کی یہ صنف ہمیشہ ممدوح و مطبوع رہی تھی۔ چنانچہ اب بھی ان کے مزارات مقدسہ پر ان کے سالانہ عرس میں بہت اچھی قوالی سننے میں آتی ہے۔ اس مخصوص طرز کے علاوہ موسیقی کے تمام دوسرے اصناف بنیادی طور پر خالص ہندوستانی ہیں۔

اودھ کے حکمران ایرانی النسل تھے اور ان کی طبیعتوں میں نزاکتوں اور لطافتوں کے جوہر تھے۔ وہ ہمارے قدیم موسیقی کے بہت جلد دلدادہ ہو گئے تھے اور اسی کی سرپرستی کر کے انہوں نے اپنے دورِ اقتدار میں بہت س اختراعات رائج کئے تھے۔ سرپرستی کا یہ ولولہ عہد شجاع الدولہ سے شروع ہو گیا تھا۔ عہد آصف الدولہ میں دار الحکومت فیض آباد سے لکھنؤ منتقل ہوا تو تمام فنکار یہیں چلے آئے۔ آصف الدولہ بھی موسیقی کے دلدادہ تھے اور ان فن کی عظمت کا ان کو بہت احساس تھا چنانچہ انہوں نے موسیقی سے متعلق ایک کتاب فارسی زبان میں لکھوائی جس کا نام 'اصول اللغات الآصفیہ' تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس فن پر اس سے بہتر کوئی کتاب نہیں لکھی گئی۔ ہو سکتا ہے کہ یہ قول انتزاعِ سلطنت اودھ تک کی مدت کے لئے صحیح ہو لیکن قدیم لکھنؤ کے آخری دور میں راقم کے محترم دوست راجہ نواب علی خاں مرحوم نے، جو اس فن میں کمال رکھتے تھے، ایک ضخیم کتاب تحریر فرمائی تھی جس کا نام معارف النغمات تھا۔ کہنے کو یہ کتاب اردو زبان میں ہے لیکن اس دور میں اردو پر عربی اور فارسی کا شدید غلبہ تھا جس کے سبب سے اس کتاب کی زبان کو اردوئے معرب کہنا زیادہ صحیح ہوگا مثال کے طور پر ایک جملہ پیش کیا جاتا ہے جس میں فاضل مصنف نے لفظ آواز کی تعریف اس طرح فرمائی ہے: 'آواز ایک ارتجاج ہے ہوائے محیط بالا بدان کا جو بہ سبب تصادم و اصطکاک اجزائے لینہ و سلبیہ کے پیدا ہو'۔ راقم کو اول الذکر کتاب کو سرسری نظر سے دیکھنے کا موقع ملا تھا اور راجہ صاحب کی تصنیف بھی دلچسپی سے پڑھی اس لئے یہ عرض کرنے میں تامل نہیں ہے کہ نقش ثانی بہر حال نقش

'نہ روم، نہ اتھینس، نہ قسطنطنیہ اور نہ ہی کوئی دوسرا شہر اتنا دلکش اور دلفریب ہوگا جتنا یہ شہر'

۱۸۵۸ میں لندن کے ٹائمس اخبار کے نامہ نگار ولیم رسیل نے یہ جملہ لکھنؤ کے لئے اپنی ایک رپورٹ میں لکھا تھا۔ سیدھے سادے لفظوں میں یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ نوابین اودھ کا عہد اپنی تمام تر خصوصیات کے ساتھ پورے ہندوستان کے افق پر غالب تھا۔ لکھنؤ شہر کی شان و شوکت کے قصے عالمی سطح پر مشہور ہونے لگے تھے۔ نواب شجاع الدولہ اور آصف الدولہ کے دور کے لکھنؤ کو جتنی مقناطیسیت حاصل ہوئی، اتنی شائد ہی دوسرے کسی شہر کو نصیب ہوئی ہو۔

پھر وہ دور بھی آیا جب شاداب کلیاں بادِ سموم کے جھونکوں سے کمھلانے لگیں اور سارا ماحول تغیر پذیر ہو گیا۔ پرانی قدروں پر نیا مزاج حاوی ہونے لگا تب اس شہر کی ہیئت بدل گئی۔ لکھنؤ اپنے شاندار ماضی سے مستقل جوجھتا رہتا ہے، دور کوئی بھی ہو، شعراء، ادباء اور فنکاروں کی دلچسپی اب بھی اسی گزشتہ لکھنؤ میں زیادہ نظر آتی ہے۔

'دامن کو چھوڑتی ہی نہیں لکھنؤ کی خاک'

اسی کے پیش نظر 'نیا دور' کے ہر شمارے میں 'گزشتہ لکھنؤ' کے عنوان سے ایک نہ ایک ایسی تحریر پیش کی جائے گی جس میں خطۂ اودھ اور بالخصوص لکھنؤ کے ادبی و تہذیبی سماج کی عکاسی نظر آئے۔ مقصد بازیافت ہے۔ اس سلسلہ کی تیسری کڑی کے طور پر مرزا جعفر حسین کی کتاب 'قدیم لکھنؤ کی آخری بہار' سے ایک تحریر **'فن رقص و موسیقی، مصوری و خطاطی'** حاضر ہے۔ ہمیں امید ہے کہ یہ سلسلہ پسند کیا جائے گا۔ 'نیا دور' ایسی تمام تحریروں کا خیر مقدم کرے گا جن میں گزشتہ لکھنؤ کی جھلک نظر آئے۔

(ایڈیٹر)

اول سے بہتر ہے۔

آواز کی متذکرہ بالا تعریف سے یہ لازمی نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ موسیقی کے عناصر ترکیبی میں سر اور لے ہیں۔ اچھی آواز اچھا سر نکالنے میں مددگار ہوتی ہے اور موسیقار کی فن کارانہ صلاحیت لے سے اس کو مزین کرتی ہے۔ یہ تزئین تعین اوقات سے حاصل ہوتی ہے اور تعین اوقات ایک سر سے دوسرے سر کا درمیانی رشتہ ہوتا ہے۔ موسیقاروں نے سر اور لے میں نرت کا اضافہ کر کے فن کو کمال تک پہنچا دیا تھا۔ نرت کے معنی ہیں، تبلانا یعنی یہ کہ جو خیال موسیقی میں پیش ہوتا تھا فنکار اسی کا نقشہ اعضا یا کسی ایک عضو کو حرکت دے کر پیش کر دیتا تھا۔ یہ فن کاری رقص میں بھی دکھائی جاتی تھی۔ شاہانِ اودھ کے دور میں عورتوں کے مقابلہ میں مرد کہیں زیادہ فنکار تھے اور انہوں نے بڑے بڑے نام پیدا کئے تھے۔ غازی الدین حیدر کے دور میں شوری نے ٹپے کا راگ ایجاد کیا تھا اور حیدری خاں جو سڑے حیدری خاں کہلاتا تھا موسیقی میں جواب نہیں رکھتا تھا۔ اس نے ایک مرتبہ صرف پوریوں اور بالائی کی تواضع پر غازی الدین حیدر کو اپنا گانا سنایا تھا اور جب بادشاہ نے خوش ہو کر اس سے کہا کہ حیدری خاں! مانگ، کیا مانگتا ہے؟ تو اس نے پہلے یہ اقرار لے لیا کہ جو مانگے گا وہ مل جائے گا، یہ درخواست کی اور اس کی فرمائش کی کہ حضور! یہ مانگتا ہوں کہ مجھے پھر کبھی نہ بلوایئے گا اور نہ گانا سنئے گا۔ بادشاہ نے متعجب ہو کر اس فرمائش کی وجہ دریافت کی تو اس نے یہ جواب دیا تھا کہ آپ کا کیا ہے؟ مجھے مروا ڈالئے گا پھر مجھ سا حیدری خاں نہ پیدا ہوگا اور آپ مر جائیں گے تو فوراً دوسرا بادشاہ ہو جائے گا۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ پھر کوئی دوسرا حیدری خاں پیدا نہیں ہوا۔

واجد علی شاہ کے دور تک لکھنؤ کی موسیقی نے اپنا پرانا رنگ بدل دیا تھا۔ ان کو موسیقی سے فطری لگاؤ تھا۔ کہا جاتا ہے کہ آرام کرنے میں ان کے پیر کا انگوٹھا ہلتا تھا تو اس میں بھی لے تھی۔ وہ خود بڑے فنکار تھے۔ ان کے یہاں تان سین کے متعدد اخلاف ملازم تھے اور موسیقاروں کو خطابات مرحمت ہوتے تھے۔ بادشاہ نے خود بھی ٹھمریاں اور دادرے تصنیف کئے تھے۔ تمام امراء و وابستگان سلطنت موسیقی کے دلدادہ تھے۔ سعادت علی خاں کے زمانہ ہی سے بڑے بڑے عالم و فاضل بھیرویں سننے کے شیدائی تھے۔ آخری دور میں اس طرزِ موسیقی میں بڑی بڑی لطافتیں پیدا کر دی گئی تھیں۔ راگ اور راگنیوں کا ذوق لکھنؤ والوں میں اتنی

> اودھ کے حکمران ایرانی النسل تھے اور ان کی طبیعتوں میں نزاکتوں اور لطافتوں کے جوہر تھے۔ وہ ہمارے قدیم موسیقی کے بہت جلد دلدادہ ہو گئے تھے اور اسی کی سرپرستی کر کے انہوں نے اپنے دورِ اقتدار میں بہت س اختراعات رائج کئے تھے۔ سرپرستی کا یہ ولولہ عہد شجاع الدولہ ہ سے شروع ہو گیا تھا۔ عہد آصف الدولہ میں دارالحکومت فیض آباد سے لکھنؤ منتقل ہوا تو تمام فنکار یہیں چلے آئے۔ آصف الدولہ بھی موسیقی کے دلدادہ تھے اور ان فن کی عظمت کا ان کو بہت احساس تھا چنانچہ انہوں نے موسیقی سے متعلق ایک کتاب فارسی زبان میں لکھوائی جس کا اصول اللغات الآصفیہ تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس فن پر اس سے بہتر کوئی کتاب نہیں لکھی گئی۔ ہوسکتا ہے کہ یہ قول انتزاعِ سلطنت اودھ تک کی مدت کے لئے صحیح ہو

شدت سے ساتھ سرایت کر گیا تھا کہ انتزاعِ سلطنت کے بعد بھی بیسوی صدی کی تیسری دہائی تک رؤسا و امرا کی محفلوں میں آئے دن موسیقی کی گرمیاں رہا کرتی تھیں۔ غزلیں بھی راگ اور راگنیوں میں گائی جاتی تھیں اور ہر ایک کے گانے کا وقت معین تھا۔ مثلاً دوپہر رات کے بعد سوہنی گائی جاتی تھی اور دوپہر دن کے بعد 'پیلو' کے لئے وقت کا تعین تھا۔ بھیرویں گانے اور سننے کے لئے علیٰ الصباح کا سہانا سماں بہت مناسب و موزوں ہوتا تھا۔ ایک گرنقدر بزرگ کے صاحبزادے کی رسم کتخدائی میں چھین چھری نے غزل جس کا مطلع یہ تھا، بھیرویں میں اس طرح گائی تھی کہ محفل میں کوئی ایسا نہ تھا جو متاثر نہ ہوا ہو۔

ہماری آنکھوں نے بھی تماشا عجب عجب انتخاب دیکھا
بھلائی دیکھی، برائی دیکھی، عذاب دیکھا، ثواب دیکھا

مصرعِ ثانی میں بھلائی، برائی، عذاب، ثواب اور پہلے مصرع میں عجب عجب اور انتخاب کے الفاظ کو علیٰحدہ علیٰحدہ اور طرح طرح سے بتایا تھا یعنی یہ کہ یہی ایک شعر تخمیناً نو دس مرتبہ گایا تھا۔ ہر مرتبہ نیا لطف آیا تھا اور ایک ہی شعر کی بار بار تکرار قطعاً ناگوار نہیں ہوتی تھی۔

انتزاعِ سلطنت اودھ کے بعد قدیم لکھنؤ کے آخری دور میں موسیقی کا سارا کمال طوائفوں میں منتقل ہو گیا تھا۔ مردوں میں جو لوگ ہنرمند تھے وہ انہیں طوائفوں کو تعلیم دیا کرتے تھے۔ جو اس پیشہ سے ناکارہ تھے وہ گوشہ نشین ہو گئے تھے البتہ رؤسا و عمائدین میں کبھی کبھی مخصوص طلبی پر جا کے اپنی صلاحیتوں کے جوہر دکھا دیتے تھے۔ بعض رؤسا و عمائدین کو خود بھی اتنا شغف تھا کہ وہ انہیں فنکاروں سے گانا سیکھتے اور راگ راگنیوں کی مشق کرتے تھے۔ ایک جلیل القدر خانوادہ کے ایک محترم بزرگ چھوٹے آغا صاحب اعلیٰ درجہ کے فنکار تھے۔ ان کو تمام راگ اور راگنیوں کے گانے میں کمال حاصل تھا لیکن رؤسا کی محفلیں ہوں یا طوائفوں کے مجرے ہر جگہ واجد علی شاہ کی رائج کردہ طرز مقبول تھی جس کی ہلکا گانا کہا جاتا تھا۔ اسی طرز اور مختلف راگنیوں میں سوزخواں مرثئے پڑھتے تھے، گھروں میں مستورات نوحے پڑھتی تھیں اور شادی بیاہ کی تقریبوں میں ڈومنیاں گایا بھی کرتی تھیں۔ طوائفیں آئے دن کسی نہ کسی رئیس کے یہاں تقاریب کے مواقع پر مجرے کرتی تھیں جس میں محلہ کے عوام کو شرکت کے لئے اجازت رہتی تھی۔ مرد اور عورت سب ہی نقل کرنے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔ من چلے اور خوش گلو نوجوان طوائف کی زبان سے جو غزل سن لیتے

تھے اس کو اسی دھن اور سر میں بآواز بلند گلیوں اور کوچوں میں الاپا کرتے تھے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ لکھنؤ کی آخری بہار شعر ونغمہ میں سرشار تھی اور در و دیوار سے ترنم اور موزونیت ٹپکا کرتی تھی۔

موسیقی کے ساتھ سنگیت کا ہونا بھی ہمیشہ لازمی رہا ہے۔ عہد قدیم میں طنبورہ، بین اور ستار بہت مقبول باجے تھے۔ ستار غالباً سب سے زیادہ پرانی ایجاد ہے۔ اس کے موجد امیر خسرو تھے۔ بین کو غالباً کبھی کوئی ممتاز جگہ سنگیت میں حاصل نہیں ہوئی۔ بین بجانے والے اس کا استعمال منفرداً ہی کرتے اور لطف اندوز ہوتے رہے ہیں البتہ طنبورہ اور ستار کو موسیقی کی سنگیت میں داخل تھا مگر سارنگی کے وجود میں آجانے کے بعد ستار کا بھی علیٰحدہ ایک مقام ہو گیا۔ بیسویں صدی کے اوائل میں موسیقار کی سنت کے لئے سارنگی اور طبلہ کافی سمجھے جاتے تھے، وہی دستور اب بھی قائم ہے۔ طنبورہ پر تو مشق فن سیکھتے ہیں یا بلند پایہ فنکار ہاتھ میں طنبورہ لے کر خود ہی بجاتے اور خود ہی گاتے تھے۔ حقیقت امر بھی یہی ہے کہ سارنگی کو ہر فنکار کے سر سے زیادہ مناسبت ہے اور ہر گانے والی کی صلاحیت کا امتحان طبلہ ہی کی تھاپ پر گانے سے ہوتا ہے۔ یہی حال طبلچی کا بھی ہے۔ اس کی فنکاری کا یہی تقاضا ہوتا ہے کہ وہ موسیقار کی تان پر طبلہ بجاتا تھال۔ مختصر یہ کہ موسیقی اور سنگیت لازم وملزوم ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ پرانے زمانے میں طوائفیں اپنے طبلچی اور سارنگئے بڑی کاوش سے تلاش کرتی تھیں۔ فنکار طوائف نئے اور نا آموزدہ کار سازندوں کے ہمراہ مجرئی کرنا پسند نہیں کرتی تھیں۔ حالانکہ تخمیناً پچاس برس قبل تک بہت اچھے سارنگئے اور طبلچی موجود تھے۔ وہ لوگ خود بھی ہر نئی نویلی گانے والی کے ساتھ طبلہ یا سارنگی بجانا گوارا نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ جودھرائن کے طبلچی عابد حسین نامی نے گھر بیٹھ رہنا گوارا کر لیا تھا لیکن چودھرائن کے بعد پھر کسی کے ساتھ طبلہ نہیں بجایا۔ یہ سارا دور ۱۹۳۰ء کے قریب ختم ہو گیا تھا۔ پھر نہ پرانے طائفے رہ گئے تھے اور نہ باکمال سازندے۔ رفتہ رفتہ نئے طرزِ موسیقی نے شرف قبول حاصل کر لیا جس کو کوئی علاقہ قدیم موسیقی سے نہیں ہے۔

رقص بھی ہندوستان کا قدیم ترین فن ہے۔ اس کو بھی فرمان روایانِ اودھ نے بجنسہ اپنا لیا تھا اور قدردانی وسرپرستی فرما کے عوام وخواص میں مقبول کرا دیا تھا۔ اس فن میں کمال یہ تھا کہ رقص کرنے والے کو اپنے حرکات وسکنات اور اپنے سارے جسم کے وزن پر قابو

> انتزاعِ سلطنت اودھ کے بعد قدیم لکھنؤ کے آخری دور میں موسیقی کا سارا کمال طوائفوں میں منتقل ہو گیا تھا۔ مردوں میں جو لوگ ہنرمند تھے وہ انہیں طوائفوں کو تعلیم دیا کرتے تھے۔ جو اس پیشہ سے کارہ تھے وہ گوشہ نشین ہو گئے تھے البتہ رؤسا وعمائدین میں کبھی کبھی مخصوص طلبی پر جا کے اپنی صلاحیتوں کے جوہر دکھا دیتے تھے۔ بعض رؤسا وعمائدین کو خود بھی اتنا شغف تھا کہ وہ انہیں فنکاروں سے گانا سیکھتے اور راگ راگنیوں کی مشق کرتے تھے۔ ایک جلیل القدر خانوادہ کے ایک محترم بزرگ چھوٹے آغا صاحب اعلیٰ درجہ کے فنکار تھے۔ ان کو تمام راگ اور راگنیوں کے گانے میں کمال حاصل تھا لیکن رؤسا کی محفلیں ہوں یا طوائفوں کے مجرے ہر جگہ واجد علی شاہ کی رائج کردہ طرز مقبول تھی جس کی ہلکا گانا کہا جاتا تھا۔

رکھنا اور حسب ضرورت ان کو استعمال کر کے مناسب مظاہرے کرنا پڑتا ہے۔ اسی کمال کا یہ نتیجہ تھا کہ فنکار تلوار کی باڑھ اور بتاشوں پر بلکہ کوڑیوں پر بھی رقص کر لیتے تھے۔ نہ تلوار کی باڑھ ان کو زخمی کرتی تھی، نہ بتاشے ٹوٹتے تھے اور نہ کوڑیاں پیروں کے نیچے پھسلتی تھیں۔ ان جسمانی حرکات کا مظاہرہ موسیقی کے طرز پر ہوتا تھا۔ رقص کی یہی تعریف تھی کہ رقاص اس طرح چلت پھرت دکھائے کہ اس میں شاعرانہ دلکشی کا لطف آ جائے۔ بالفاظ دیگر جذبات کی بھرپور ترجمانی رقص میں ہو جائے اور اسی نمائش جذبات کا اسلامی نام 'نرت' رکھا گیا تھا اور اودھ کے حکمرانوں کی ملازمت میں بڑے بڑے باکمال رقاص تھے۔ اس فن میں بھی لکھنؤ ہی کو افضلیت حاصل تھی اور یہ خصوصیت تو ہمیشہ یادگار رہے گی کہ اس شہر نے باکمال رقاصوں میں ایک ایسا خاندان پیدا کر دیا جس میں یکے بعد دیگرے بڑے بڑے ہنرمند رقص کرنے والے پیدا ہوئے جن کی شہرت سارے ملک پر بلکہ بیرون ہند بھی چھائی ہوئی تھی۔ سعادت علی خاں، غازی الدین حیدر اور نصیر الدین حیدر ان تینوں فرمان رواؤں کے عہد میں من جملہ دوسرے فنکاروں کے پرکاش جی بڑا نامور رقاص تھا۔ محمد علی شاہ کے دور سے واجد علی شاہ کے انتزاعِ سلطنت تک پرکاش جی کے دونوں لڑکوں، درگا پرشاد اور ٹھاکر پرشاد نے رقص میں بڑے بڑے جوہر دکھائے تھے۔ واجد علی شاہ نے رقص کا فن درگا پرشاد سے سیکھا تھا اور اتنا کمال حاصل کر لیا تھا کہ وہ خود ایک گرانقدر رقاص اور فن میں بہت سے پہلوؤں کے موجد تھے۔ انہوں نے اس فن میں اپنی اختراعات پر مشتمل اپنی ایک تصنیف بھی اپنے ہی مطبع سے شائع کی تھی جس کا نام 'بنی' تھا۔ درگا پرشاد کے جانشین ان کے دونوں لڑکے کالکا اور بندادین تھے۔ پرانے استادوں میں ہر ایک رقص کے کسی ایک مخصوص فن کا ماہر تھا لیکن یہ دونوں بھائی تمام فنون میں کمال رکھتے تھے۔ دونوں بھائی ملک بھر میں شہرت کے مالک تھے۔ ان کا گھر رقص کا ایک اسکول تھا۔ کالکا کا بہت پہلے انتقال ہو گیا تھا لیکن بندادین مدت تک بقید حیات رہا تھا۔ ڈیرے دار طوائفوں کی چودھرائن یعنی دونوں بہنیں تنہو اور بچوا بندادین ہی کی شاگرد تھیں۔ بندادین کے بعد اس گھر کے تین لڑکوں یعنی اچھن، سمجھو اور لچھو نے اپنے بزرگوں کا نام زندہ رکھا تھا۔ راقم کو ان تینوں فنکاروں کے کمالات دیکھنے کا شرف حاصل ہوا تھا اور اب بھی ان کا مکان واقع بازار جھاؤلال دیکھ کر آنکھیں ڈبڈبا

آتی ہیں اور عظمت پارینہ کی یاد دل کو تڑپا دیتی ہے۔

رقص کا فن بھی ابتداً مردوں سے مخصوص تھا لیکن عہد شاہی میں طوائفوں نے اس فن کو سیکھ لیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ بہت پرانے زمانے میں بھی طوائفیں بہت اچھا رقص کرتی تھیں لیکن راقم نے دونوں بہنوں ننھو اور بچوا کا رقص بے شمار بار دیکھا تھا جو اپنے زمانے میں اپنا جواب نہیں رکھتی تھیں۔ ان میں منجملہ بہت سی دوسری خوبیوں کے ایک کمال یہ تھا کہ گھنگھرو بجانے میں جتنے گھنگھرو وہ چاہتی تھیں اتنے ہی بجتے تھے۔ دونوں پیروں میں گھنگرو باندھ کے رقص ہوتا تھا جن میں درجنوں گھنگرو لگے رہتے تھے۔ ننھو نے ایک بار دونوں پیر ملائے تھے لیکن صرف ایک گھنگرو بولا تھا۔ یہ سلیقہ عام لوگوں کی سمجھ سے اس وقت بھی باہر تھا۔ موسیقی سے زیادہ رقص بتانے کی صلاحیت ضروری تھی۔ چنانچہ یہ بہنیں بھی ایک ہی بات کو سو سو اداؤں، دلفریب اشاروں، نزاکتوں اور طرح طرح کی وضع سے بتاتی تھیں۔ لکھنؤ کی ایک یہ بھی خصوصیت تھی کہ یہاں رقص میں مردانے اور زنانے طرز علیٰحدہ علیٰحدہ نمایاں رہا کرتے تھے۔ مردوں کے رقص میں شاعرانہ دلکشی ہوتی تھی۔ عورتوں کے یہاں معشوقانہ انداز۔ نازنین لطافتوں اور پرکیف نزاکتوں کے مظاہرے ہوتے تھے۔ ہر شادی بیاہ کے موقع پر طوائفوں کے علاوہ مردوں کے بھی طائفے بلائے جاتے تھے جن کو بھانڈوں کا طائفہ کہتے تھے۔ ان میں بھی بہت اچھے اچھے موسیقار اور رقاص تھے۔ ایسے ہی مواقع پر رقص میں مردانہ اور زنانہ طور کے علیٰحدہ علیٰحدہ جوہر نمایاں رہتے تھے۔

بھانڈوں کا طائفہ اپنے طور طریقوں میں طائفوں کے مجروں سے زیادہ بہت مختلف ہوتا تھا۔ طوائفوں کے ہمراہ صرف سازندے ہوتے تھے اور ان کے کمالات صرف موسیقی کی لطافتوں تک محدود ہوتے تھے لیکن بھانڈوں کے طائفے میں اصل موسیقار جس کے نام سے طائفہ مشہور ہوتا تھا، زنانے لباس اور زنانے طرز سے چوٹی باندھے، ماتھے پر ٹیکہ لگائے، ہاتھوں میں زیور پہنے اور طوائف کے لباس اور پیشوا زمین بر سر محفل آتا تھا۔ اس کے ہمراہ سازندے اور کچھ بھانڈ مردانے مگر خصوص وضع کے لباس میں ہوتے تھے جو پہلے اپنے کرتب دکھاتے پھر بھانڈ کے رقص و موسیقی

رقص کا فن بھی ابتداً مردوں سے مخصوص تھا لیکن عہد شاہی میں طوائفوں نے اس فن کو سیکھ لیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ بہت پرانے زمانے میں بھی طوائفیں بہت اچھا رقص کرتی تھیں لیکن راقم نے دونوں بہنوں ننھو اور بچوا کا رقص بے شمار بار دیکھا تھا جو اپنے زمانے میں اپنا جواب نہیں رکھتی تھیں۔ ان میں منجملہ بہت سی دوسری خوبیوں کے ایک کمال یہ تھا کہ گھنگھرو بجانے میں جتنے گھنگھرو وہ چاہتی تھیں اتنے ہی بجتے تھے۔ دونوں پیروں میں گھنگرو باندھ کے رقص ہوتا تھا جن میں درجنوں گھنگرو لگے رہتے تھے۔ ننھو نے ایک بار دونوں پیر ملائے تھے لیکن صرف ایک گھنگرو بولا تھا۔ یہ سلیقہ عام لوگوں کی سمجھ سے اس وقت بھی باہر تھا۔ موسیقی سے زیادہ رقص بتانے کی صلاحیت ضروری تھی۔ چنانچہ یہ بہنیں بھی ایک ہی بات کو سو سو اداؤں، دلفریب اشاروں، نزاکتوں اور طرح طرح کی وضع سے بتاتی تھیں۔ لکھنؤ کی ایک یہ بھی خصوصیت تھی کہ یہاں رقص میں مردانے اور زنانے طرز علیٰحدہ علیٰحدہ نمایاں رہا کرتے تھے۔ مردوں کے رقص میں شاعرانہ دلکشی ہوتی تھی۔ عورتوں کے یہاں معشوقانہ انداز۔ نازنین لطافتوں اور پرکیف نزاکتوں کے مظاہرے ہوتے تھے۔

میں ہمت افزائی کرتے تھے۔ ان کا پہلا کرتب گھوڑے بننا اور گھوڑے چھوڑنا تھا جس میں شہسواری کی تمام اصطلاحات استعمال ہو جاتی تھیں۔ اس کرتب بازی اور بھانڈ کے رقص و موسیقی کے درمیان ہمراہیوں کے لئے کوئی نہ کوئی نقل پیش کرنا ضروری تھا۔ یہ نقل انتہائی سنجیدگی اور لطافت کے ساتھ اسی رئیس کی اتاری جاتی تھی جس کے یہاں وہ مدعو ہوتے تھے۔ اس سلسلہ میں ایک رئیس کے یہاں کا واقعہ پیش کیا جاتا ہے جو چودھری صاحب کے لقب سے مشہور تھے۔ ان کے لڑکے کی شادی میں بھانڈوں کا طائفہ تھا۔ ان بھانڈوں میں ایک شخص بڑی گھنی اور دراز داڑھی لگا کر اور عبا قبا و عمامہ پہن کر تقدس مآب قاضی کے بھیس میں دوزانو بیٹھا تھا۔ ناگہان چار آدمی، ایک بچہ درآغوش عورت کے ہمراہ سامنے آکر حاضر ہوئے۔ ان چاروں میں بظاہر سب سے زیادہ طرار شخص نے قاضی کے حضور عرض کیا کہ ہم چاروں ایک دوسرے کے بہت گہرے دوست ہیں۔ ہمارے درمیان کبھی کوئی نزاع واقع نہیں ہوا۔ باہمی خلوص و محبت اتنا ہے کہ ہم سب ایک ساتھ اٹھتے بیٹھتے، رہتے سہتے اور کھاتے پیتے ہیں۔ ہم میں کی کوئی فرد کوئی کام تنہا نہیں کرتی۔ ہم نے اس عورت سے منھ کالا کی، تب بھی سب برابر کے شریک رہے اور کوئی رشک و حسد کا جذبہ ہم میں سے کسی میں بھی پیدا نہیں ہوا۔ یہ عورت حاملہ ہو گئی اور بچہ پیدا ہوا ہے۔ اب یہ جھگڑا کھڑا ہو گیا ہے کہ یہ بچہ کس کا کہلائے کیونکہ میں شیخ ہوں، یہ پٹھان ہے، یہ تیسرا مغل ہے اور چوتھا سید ہے۔ قاضی صاحب نے بڑے غور و خوض سے مقدمہ سنا، اپنے پیٹ کو سہلایا اور اوپر دیکھا پھر چاروں آدمیوں سے مخاطب ہو کر یہ فرمایا کہ یہ بچہ چودھری ہے۔

اس واقعہ پر نیز اسی قسم کے دوسرے بہت سے واقعات پر کبھی کسی رئیس کو شکایت پیدا نہیں ہوئی بلکہ اس کے برعکس بھانڈوں کی ان ستم ظریفیوں کی قدردانیاں ہوتی تھیں۔ ان کے مجرے مستورات میں اس طرح پسند کئے جاتے تھے جیسے کہ طوائفوں کی موسیقی و رقص مردوں کو مرغوب تھے۔ آخری دور میں بھانڈوں کے کئی اچھے طائفے موجود تھے۔ یہ لوگ اپنے کو کشمیری نسل کا کہتے تھے لیکن طائفوں میں سب ہی کشمیری ہوں یہ بات مشکوک ہے۔ آخری دور کے طائفوں میں جن کی فنکاریوں سے راقم کو لطف اندوز

ہونے کا موقع ملا تھا، مصطفیٰ حسین اور علی جان کے نام قابل ذکر ہیں۔ راقم کی شادی میں مصطفیٰ حسین جن کو ان کے ہمراہی بھانڈ میاں مصطفیٰ حسین کہتے تھے، کا طائفہ بلایا گیا تھا۔ ان بھانڈوں نے میرے بی اے پاس ہونے کا گٹ پٹ کرکے مذاق اڑایا تھا اور میرے والد مرحوم کو ان کی پرانی وضع قطع کا حوالہ دے کر اپنا ہم قوم قرار دیا تھا جس کی وجہ یہ تھی کہ ہمارے مورث اعلیٰ ایران سے براہِ کشمیر ہندوستان آئے تھے۔ ان بھانڈوں کا یہ دستور تھا کہ جہاں بلائے جاتے وہاں کے جملے، حالات اور رئیس کا حسب نسب پہلے دریافت کر لیتے تھے اور انہیں معلومات سے اپنی نقل سازی میں فائدہ اٹھاتے تھے۔ ہمارے گھر پر بھی یہی کھیل تماشہ ہوا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ والد مرحوم برابر مسکراتے رہے تھے اور انہوں نے کوئی اثر قبول نہیں کیا تھا لیکن میری پیشانی عرق آلود تھی۔

مصوری و خطاطی

عہد شاہی کے ابتدائی دور میں یورپ کے ماہرین مصوری کو درباروں میں رسوخ حاصل تھا۔ ان میں خصوصیات کے ساتھ زوفینی کا نام بہت مشہور تھا۔ اس نے متعدد تصویریں بنائی تھیں جن کا شمار عدیم المثال فنی شاہکاروں میں ہوتا تھا۔ اس کی ایک تصویر مرغ بازی سے متعلق تھی جس کی ایک رنگین پلیٹ کچھ مدت تک امیر الدولہ پبلک لائبریری، قیصر باغ، لکھنؤ میں موجود تھی۔ یہ مصور عہد آصف الدولہ میں آیا تھا۔ اس کے بعد مصوری کے فن میں ہوم اور اس کے لڑکے کے نام ملتے ہیں جو غازی الدین حیدر کے دربار سے منسلک تھے۔ نصیر الدین حیدر کے یہاں ایک جرمن مصور ملازم تھا۔ یہی سلسلہ واجد علی شاہ کے عہد تک چلتا رہا تھا لیکن یہ بات قابل لحاظ ہے کہ ان بدیسی مصوروں نے اپنا کوئی نقش اودھ کی مصوری پر نہیں چھوڑا اور نہ یہاں کے مصور ان سے متاثر ہو سکے۔ اودھ کا مایۂ ناز مصور ٹھاکر داس اپنی امتیازی شان میں سب سے علیٰحدہ ہی رہا تھا اور اپنا کمال اس وقت دکھا دیا جب انگریز ریزیڈنٹ نے غازی الدین حیدر کے حضور ہندوستانی مصوری کی منقصت کی تھی اور بادشاہ کو بہت ناگوار ہوا تھا۔ ٹھاکر داس انگریزی زبان سے بالکل ناواقف تھا لیکن اس نے ایک سرکاری نوٹ کی ہوبہو نقل بنا کے پیش کر دی تھی جس کو دیکھ کر ریزیڈنٹ دھوکہ کھا گیا اور یہ معلوم

لکھنؤ کی مصوری انگریزی طرز سے بالکل علیٰحدہ اپنا مقام رکھتی تھی۔ ٹھاکر دس روغنی اور آبی تصاویر بناتا تھا۔ اس کے علاوہ ہندوستانی روایت کی تمثیلی تصویریں بنانے میں بھی ماہر تھا۔ اس نے راگ اور راگنیوں کی بے انتہا حسین اور جاذب نظر تصویریں بنا کر غازی الدین حیدر کو پیش کی تھیں جو بادشاہ کو بہت پسند آئی تھیں اور بہت مقبول ہوئی تھیں۔ ٹھاکر داس کے علاوہ اور بہت مصور تھے جنہوں نے اس فن کے ایک دوسرے مخصوص طرز میں کمال حاصل کر لیا تھا۔ یہ لوگ اپنی تصویروں میں سونا چڑھانے، سفیدہ بھرنے اور رنگ دینے کی ہنرمندی میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ ایسے باکمال لوگوں میں محمد علی عرف 'مانی رقم' اور اسکے بیٹے فضل علی عرف 'بہزاد رقم' کے نام تاریخ مصوری مین ہمیشہ زریں حروف میں لکھے رہیں گے۔ بہزاد رقم واجد علی شاہ کے دربار سے وابستہ تھا۔ ان نے خاندان شاہی کے بعض محلات اور زنانہ مناظر کی لاجواب تصویریں بنائی تھیں۔ اسی دور میں اور بھی باکمال مصور تھے جن میں بیجو بیگ، صاحب رائے، کاظم حسین خاں، درگا پرشاد اور کاشی رام کے نام خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔

ہونے پر کہ وہ دستاویز اصل نہ تھی بلکہ نقل تھی، وہ مبہوت ہو کر معذرت خواہی کرنے لگا تھا۔

لکھنؤ کی مصوری انگریزی طرز سے بالکل علیٰحدہ اپنا مقام رکھتی تھی۔ ٹھاکر دس روغنی اور آبی تصاویر بناتا تھا۔ اس کے علاوہ ہندوستانی روایت کی تمثیلی تصویریں بنانے میں بھی ماہر تھا۔ اس نے راگ اور راگنیوں کی بے انتہا حسین اور جاذب نظر تصویریں بنا کر غازی الدین حیدر کو پیش کی تھیں جو بادشاہ کو بہت پسند آئی تھیں اور بہت مقبول ہوئی تھیں۔ ٹھاکر داس کے علاوہ اور بہت مصور تھے جنہوں نے اس فن کے ایک دوسرے مخصوص طرز میں کمال حاصل کر لیا تھا۔ یہ لوگ اپنی تصویروں میں سونا چڑھانے، سفیدہ بھرنے اور رنگ دینے کی ہنرمندی میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ ایسے باکمال لوگوں میں محمد علی عرف 'مانی رقم' اور اسکے بیٹے فضل علی عرف 'بہزاد رقم' کے نام تاریخ مصوری میں ہمیشہ زریں حروف میں لکھے رہیں گے۔ بہزاد رقم واجد علی شاہ کے دربار سے وابستہ تھا۔ ان نے خاندان شاہی کے بعض محلات اور زنانہ مناظر کی لاجواب تصویریں بنائی تھیں۔ اسی دور میں اور بھی باکمال مصور تھے جن میں بیجو بیگ، صاحب رائے، کاظم حسین خاں، درگا پرشاد اور کاشی رام کے نام خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ اسی زمانہ میں ایک مصور میر محمد علی بھی تھے جن کے بارے میں پورے وثوق کے ساتھ کہا جاتا تھا کہ انہوں نے دل آرام کی بارہ دری میں میر انیسؔ کے پڑھنے کی مجلس کا ایک نایاب روزگار قلمی مرقع تیار کیا تھا۔ سامعین کی نشست کا اندازہ، میر انیسؔ کے منبر پر بیٹھنے کا اسلوب، ہاتھ میں مرثیہ لئے رہنے کا طرز، یہ تمام صورتیں اس مرقع میں ہو بہو نمایاں کر دی تھیں اور ان تمام خوبیوں کے ساتھ یہ صفت گری بھی تھی کہ میر انیس کے ہاتھ میں جو مرثیہ تھا اس کے مطلع کا پہلا مصرعہ اپنے صحیح مقام پر اس تصویر میں واضح تھا۔ وہ مصرع یہ تھا 'بزم ہے مرقع چمنستان جہاں کا' بیسویں صدی کے اوائل تک انیسؔ کے بہت سے قدردانوں کے پاس اس مرقع کے نقول محفوظ تھے۔ راقم کو بھی ایک ایسی ہی نقل دیکھنے کا شرف کئی بار حاصل ہوا تھا۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ فوٹو گرافی کا چلن عام ہو چکا تھا، اسی سے فائدہ اٹھا کر رئیسوں نے اس مرقع کی تصویریں چھپوا کے آپس میں تقسیم کر لی

تھیں۔ ایسی تصویریں تخمیناً پچیس تیس برس قبل تک دیکھنے میں آجاتی تھیں جن کو لوگ عقیدتاً اپنے اماموں باڑوں میں آویزاں رکھتے تھے۔

لکھنؤ کے فن مصوری کی یہ بدنصیبی تھی کہ یہاں زوالِ اقتدار کے ساتھ ہی باکمال لوگوں کا قحط پڑنا شروع ہوگیا تھا۔ اس کے علاوہ مذاق بھی رفتہ رفتہ بدل گیا۔ پرانے شہپاروں کے نقوش کو برقرار بھی نہیں رکھا جاسکا۔ ہمارے بعض قدیم رؤسا و عمائدین اپنی وضع داریوں کے تحت فنکاری کے باقیات الصالحات کو ایک مدت تک کلیجے سے ضرور لگائے رہتے تھے۔ ان کے درباروں اور خواب گاہوں میں منجملہ بہت سے دوسرے سامان آرائش کے ایسے مرقعے بھی آویزاں رہتے تھے لیکن جب دولت پر زوال آیا اور دولت خانوں پر فلاکت منڈلانے لگی تو اثاث البیت کے ساتھ یہ نوادر بھی کوڑیوں کے بھاؤ فروخت ہو گئے۔ بیرونی سیاح آتے تھے اور نخاس کی بازار سے ان کے سستے داموں گویا مفت حاصل کرکے اسے ہمراہ لے جایا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ ہمارا یہ خزینہ بھی خالی ہے۔ بعض قلم کاری کے بہترین نمونے کچھ تعلقداروں کے یہاں بھی موجود تھے۔ اس سلسلہ میں مہاراجہ صاحب بہادر والی محمود آباد، راجہ صاحب جہانگیر آباد اور راجہ صاحب سلیم پور کے نام یاد آتے ہیں لیکن ان بیش بہا عجائبات کا کیا حشر ہوا، اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا کیونکہ زمانہ نے تعلقداروں کے پاس بجز ان کے نام کے اور کچھ نہیں چھوڑا۔ بہرحال اب لکھنؤ میں معدودے چند فن پارے اور کچھ پرانی مصوری کے نقول عجائب گھر، شاہ نجف اور امیر الدولہ لائبریری میں موجود ہیں۔

راقم نے جو پرانی قلمی تصویریں دیکھی تھیں، ان میں امرا کی شبیہیں، شاہی عمارات کے نقشے، جلسہ و جلوس، محلات و دربار کے مناظر، رقص و سرور کی محفلیں، میدان جنگ کی لڑائیاں یا سیر و شکار کی دلچسپیاں بنی ہوئی تھیں۔ پس منظر میں آسمان پر رنگ بہ رنگ بادل اور اڑتے ہوئے طیور تھے اور زمین پر پھولوں سے ڈھکی ہوئی برجیوں ادوار، دیوار یا پھر قطار اندر قطار درخت دکھائے گئے تھے۔ یہ فنکاریاں کاغذ یا کرمچ یا شیشۂ ابرق پر دکھائی گئی تھیں۔ ایسی ہی قلم کاری ہاتھی دانت اور ظروف وغیرہ پر بھی ہوتی تھی۔ چونکہ تصویر کشی بہترین قسم کی خطاطی ہوتی ہے اسی لئے ہمارے قدیم رؤسا کو

خوش نویسی میں گلکاریوں کے اسلوب اور فنکاروں میں صنعت گری کو نظرانداز کردیجئے تو تحریر میں بنیادی طور پر صرف دو خط باقی رہ جاتے ہیں۔ خط نسخ و خط نستعلیق۔ اول الذکر خط کوفی کی ترقی شدہ شکل ہے اور اس خط میں عربی لکھی جاتی ہے۔ خط نستعلیق فارسی اور اردو میں مستعمل ہے۔ شاہی زمانہ میں دونوں خط رائج تھے اور دونوں کے بہترین خطاط موجود تھے لیکن رفتہ رفتہ خط نستعلیق پر بڑی بڑی ریاضتیں کی گئیں۔ بیسویں صدی کے اوائل میں نسخ میں خطاط بہت کم رہ گئے تھے لیکن نستعلیق لکھنے والوں کی تعداد کثیر تھی۔ خوش نویسی کے ذوق میں خاندان کے خاندان مشہور تھے۔ رؤسا و عمائدین میں بھی بہت سے خوش نویس تھے لیکن بالآخر اس فن پر بھی زوال آ گیا۔ آخری دور میں معدودے چند خوش نویس رہ گئے تھے جن میں سید محمد جواد مالک نظامی پریس اور شیخ ممتاز حسین جونپوری کے نام قابل ذکر ہیں۔ یہ دونوں صاحبان نسخ اور نستعلیق دونوں میں کمال رکھتے تھے۔ اس فن کے مٹ جانے کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ چھاپے خانے کھل گئے تھے جن میں اچھے خوش نویس ملازمت کرنے پر تیار نہیں ہوئے۔ وہ لوگ رؤسا و امرا کے دامن دولت سے متمسک رہے اور انہیں کے ساتھ ختم ہو گئے۔

یکساں طور پر کتبوں کا کا بھی ذوق تھا۔ ان کے درباروں نیز ان کی خواب گاہوں میں انتہائی حسین اور جاذب نظر کتبے آویزاں رہتے تھے جن میں آیات قرآنی، ادعیہ، ناد علی اور بعض پسندیدہ اشعار خط نسخ و نستعلیق میں لکھے ہوئے تھے۔ بعض کتبے عہد قدیم سے متعلق تھے۔ خطاطی شاہی زمانے ہی سے بہت مرغوب شوق تھا۔ بعض بادشاہ بھی بہت اچھے خوش نویس تھے جن میں سعادت علی خاں کا نام سرفہرست آتا ہے۔ انہوں نے یہ فن علامہ تفضّل حسین خاں سے سیکھا تھا جو خود بھی بڑے بلند فنکار تھے اور ان کے صاحبزادے تجمل حسین خاں بھی بہت اچھے خوش نویس تھے۔ تخمیناً پچاس برس قبل تک خان علامہ کے اخلاف میں خوش نویس کا فن برقرار رہا تھا۔

خوش نویسی میں گلکاریوں کے اسلوب اور فنکاروں میں صنعت گری کو نظرانداز کردیجئے تو تحریر میں بنیادی طور پر صرف دو خط باقی رہ جاتے ہیں۔ خط نسخ و خط نستعلیق۔ اول الذکر خط کوفی کی ترقی شدہ شکل ہے اور اس خط میں عربی لکھی جاتی ہے۔ خط نستعلیق فارسی اور اردو میں مستعمل ہے۔ شاہی زمانہ میں دونوں خط رائج تھے اور دونوں کے بہترین خطاط موجود تھے لیکن رفتہ رفتہ خط نستعلیق پر بڑی بڑی ریاضتیں کی گئیں۔ بیسویں صدی کے اوائل میں نسخ میں خطاط بہت کم رہ گئے تھے لیکن نستعلیق لکھنے والوں کی تعداد کثیر تھی۔ خوش نویسی کے ذوق میں خاندان کے خاندان مشہور تھے۔ رؤسا و عمائدین میں بھی بہت سے خوش نویس تھے لیکن بالآخر اس فن پر بھی زوال آ گیا۔ آخری دور میں معدودے چند خوش نویس رہ گئے تھے جن میں سید محمد جواد مالک نظامی پریس اور شیخ ممتاز حسین جونپوری کے نام قابل ذکر ہیں۔ یہ دونوں صاحبان نسخ اور نستعلیق دونوں میں کمال رکھتے تھے۔ اس فن کے مٹ جانے کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ چھاپے خانے کھل گئے تھے جن میں اچھے خوش نویس ملازمت کرنے پر تیار نہیں ہوئے۔ وہ لوگ رؤسا و امرا کے دامن دولت سے متمسک رہے اور انہیں کے ساتھ ختم ہو گئے۔ چھاپے خانوں کی بدولت فن خطاطی میں ایک ہنر کا بہرحال اضافہ ہوا۔ یہ فن مصلح سنگی کے نام سے موسوم ہوا اور آج بھی مصلح سنگ ہر چھاپے خانے کے لئے ایک ناگریز فرد ہے۔

❑❑❑

کترنیں

سدرشن وششٹھ
کرشن نواس، لووَر پنتھا گھاٹی، شملہ
موبائل: 9418085595

یہ گھر مرغی کے پنکھوں کی طرح چھایا ہوا تھا۔ سلیٹ کی چھت ایک دم نیچے نیچے جہاں سے آدمی بس سیدھا ہو کر صرف گزر بھی سکتا تھا۔ نوگزہ آدمی آجائے تو سر چھت سے ٹکرائے۔ ایسا لگتا تھا کہ ابھی مرغی آواز نکالتی ہوئی گردن پھلا کر پنکھ پھیلائے گی تو چھت بالکل زمین سے آ گے لگی۔ سب ہی لوگ گھر کے اندر آجاتے تو ایسا محسوس ہوتا کہ چھت ایک دم نیچے آ گئی ہے اور گھر چاروں طرف سے بند ہو گیا ہے۔ کم از کم اسے تو ایسا ہی لگتا۔ بچپن میں جب باپو کوئی ڈراؤنی کہانی سناتے تو وہ سر سے پاؤں تک 'کھنڈ' (ایک مقامی اونی شال) اوڑھے سو جاتا۔ چاہے پسینہ پسینہ ہی کیوں نہ ہو جائے، کہیں سے بھی باہر سے روشنی اندر نہیں آنی چاہئے۔ اندر ہی اندر ایک محفوظ دنیا بن جاتی۔ گھپ اندھیرا مگر محفوظ۔ اس طرح کھنڈ کے اندھیرے میں چھپنے سے لگتا، وہ سب ہی راکشسوں، بھوت پریتوں سے محفوظ ہے۔ گودڑ کی کھنڈ قلعے سے بھی محفوظ لگتی۔ اس کے اندر چھپنے سے سارے ہی راکشس دیوار کے باہر غائب ہو جاتے جیسے گھوڑا شیر کے آنے پر آنکھیں بند کئے کھڑا ہو جاتا ہے۔ آنکھیں بند کر لیں تو سمجھئے کوئی خطرہ ہے ہی نہیں۔ آنکھیں بند، کچھ سوجھے گا نہیں تو خطرہ بھی نہیں سوجھے گا۔ جو نظر آئے وہی خطرہ ہے۔ اسی سے خوف ہے۔ اسی طرح گھر گھپ اندھیرے اور مٹی کی کمزور دیواروں کے باوجود قلعے سے بھی مضبوط لگتا۔ سارا ڈر، خوف، انہونی گھر کی حدود سے باہر تھی۔

ویسے بی باپو نے گاؤں کے تانترک پنڈت سے پوری 'باسی' میں 'کار' ڈلوائی ہوئی تھی۔

گھر باپ دادا کس نے بنوایا ہوگا، معلوم نہیں حالانکہ موٹی موٹی کالی دیواروں میں دراریں آنے لگی تھیں جن میں ہر سال مٹی بھر کر پوت دی جاتی تھی۔ اس مٹی کے گھر سے چیونٹیوں کی طرح بچوں کی قطاریں نکلتی رہیں۔

> ہندی کے معروف افسانہ نگار اور شاعر سدرشن وششٹھ پہاڑوں کی خوبصورتی کے ساتھ ساتھ وہاں کی تہذیب و ثقافت کے پس منظر میں شاعری کرنے اور افسانے لکھنے کے لئے مشہور ہیں۔
>
> افسانوں کے ان نو مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ اس کے علاوہ دو ناولٹ اور چنندہ کہانیوں کے چار مزید مجموعے بھی شائع ہو چکے ہیں۔ اس کے علاوہ چار شعری مجموعے بھی منظر عام پر آ چکے ہیں۔ ہماچل پردیش کی ثقافت پر چھ جلدوں میں 'ہمالیہ گاتھا' بھی شائع ہو چکی ہے۔ انہیں مختلف قومی اور ریاستی انعام و اعزازات سے نوازا جا چکا ہے۔
>
> سدرشن وششٹھ کی 'کترنیں' کہانی کا ترجمہ مشہور مترجم **حیدر جعفری سید** نے کیا ہے۔

چیونٹیوں کی طرح یکے بعد دیگرے سات نہیں نکلیں اور آخر میں ایک مکوڑا۔ بچپن میں اس کا نام مکوڑا تھا۔ جیسے مرغی سے اڑنے سے پنکھ بکھرے رہتے ہیں اسی طرح گھر میں بھی کپڑوں کی کترنیں بکھری رہتیں۔ یہ رنگ برنگی کترنیں گھر میں گرماہٹ تو دیتی تھیں، ان کو اکٹھا کر ان میں شیر خوار بچے بھی سلائے جاتے۔ رنگین کترنوں سے چھوٹے چھوٹے رنگین کرتے پاجامے، شلواریں، قمیصیں بن جاتیں، جب گھر سے رنگ برنگے بچوں کی قطاریں نکلتیں تو گاؤں والوں کے لئے اچھی تفریح ہو جاتی۔

یہ مکوڑے عرف مست رام کا گھر ہے۔

مشہور درزی تھا بیلی رام۔ جب اسے شادی بیاہ میں کپڑے سینے کے لئے گھر میں بٹھایا جاتا تو کپڑے کم سیتا، تفریح زیادہ کرتا۔ گاؤں کے چند بڑے گھر شادی بیاہ کے علاوہ بھی سال میں ایک دو بار گھر میں درزی بٹھاتے تھے۔ گھر میں درزی بٹھانا ایک شان کی بات بھی تھی۔ بیلی رام علاقے میں پہلی مشین لایا تھا۔ اسے ایسے میں خوب مزہ آتا تھا۔ کھانا پینا، چائے پانی، چلم تمباکو سب ان کے سر۔ کام کرنا یا نہ کرنا اس کے بس میں۔ کبھی کبھی پورا پورا دن ساری ساری رات کہانیوں میں گزار دیتا۔ گھاٹا تو یہی تھا کہ وہ کسی قسم کا کپڑا یا کترنیں وہ اپنے گھر نہیں لے جا سکتا تھا۔ خاندان والے پوری نگاہ رکھتے۔ زیادہ تر لوگ جنس کے بدلے بازار سے ایک پورا تھان گھر کے مردوں اور بچوں کے لئے خریدتے۔ کھدر، مارکین، جوخانہ، ملیشیا بہت ہوا تو لٹھا۔ عورتوں کے لئے کوئی بھی پھول چھاپ موٹا تھان۔ جن عورتوں کے بچوں نے ایک سے کپڑے پہنے ہوں، سمجھ لیجئے ایک ہی گھر کے ہیں اور اچھے گھر کے ہیں۔ جہاں سال بھر کے لئے پورا تھان خریدنے کی اہلیت ہے۔ عورتوں کے لئے یہ آزمائش کی گھڑی ہوتی۔ منجھلی تو اس کپڑے میں پھول کی طرح کھل جاتی، بڑی اور بھی مرجھائی لگتی۔ اس وقت اسکول نہ کے برابر تھے۔ تھے

بھی تو ان میں 'وردی' جیسی کوئی چیز نہیں تھی۔ سب ہی اپنی اپنی قسم کے کچھا، پاجامہ یا صرف لمبا کرتا پہن کر آتے تھے۔ جب بڑے بڑے اسکول کھلے اور ان میں 'وردی' ضروری قرار دی گئی تو بیلی رام نے سمجھا یہ ان ہی خاندانوں کی دین ہے۔ بیلی رام کو تو جس نے کپڑا سینے کے لئے دیا وہ سال چھ مہینے سے نہیں ملا۔ کئی بار کپڑا رکھے رکھے چوہوں نے کتر ڈالا اور آخر میں بیلی رام کی چیونٹیوں اور مکوڑے کے ہی کام آیا۔ بیلی رام سے سب ہی دکھی تھے لیکن کرتے بھی کیا، گاؤں میں صرف ایک ہی درزی کا گھر تھا۔

مست رام اسی بیلی رام کا مکوڑا تھا۔

مہین سے مہین کپڑا ہاتھ سے سینا اس کی خصوصیت تھی۔ کوئی پتہ نہیں لگا سکتا تھا کہ سلائی ہاتھ سے کی گئی ہے یا مشین سے۔ اتنی باریک، اتنی مضبوط بغیر ناپ لئے کسی بھی عورت کی قمیص، شلوار، گھگھری سینا دوسری خصوصیت۔ بس بتانا ہوتا تھا کہ فلاں ساس یا بہو کے کپڑے ہیں۔ عورتوں میں ناپ دینے کا تو رواج ہی نہیں تھا۔ اندازے سے ہی ایسی فٹنگ آتی کہ بس۔ اس پر گونا کناری، گاؤں کی عورتیں تو اسی سے کپڑے سلواتی تھیں۔ مرد بھی بیلی رام کے بجائے اس سے ہی کپڑے سلانا پسند کرتے۔ سلائی کے بعد ایک ایک کترن واپس کرنا تیسری خصوصیت۔ عورتوں کی کالر والی اور لمبی جیبوں والی قمیص، چوڑی دار ستھن سینے والی، وہی ایک کاریگر تھی۔ گھر میں بچی چھوٹی چھوٹی کترنوں سے کھنڈ کے غلاف اور اندر بھرنے کے لئے سلیقے سے لہریں رکھنا اسی کو آتا تھا۔ ایک ایک کترن سے بہت سلیقے سے بچوں کے کپڑے سینا، ان ہی کترنوں سے لڑکیوں کی شادی میں جہیز کے لئے خوبصورت اور سڈول ہاتھ گھوڑے بنانا۔ پانی بھرنے کے لئے گھڑے کے نیچے رکھنے کے لئے خوبصورت ڈور والے بتے، بیٹھکو اور نہ جانے کیا کیا۔ اس کے گھر میں ایک بھی کترن فالتو نہیں جاتی تھی۔ اس کشیدہ کاری کے علاوہ بیلی رام کی خدمت اس کے لئے لڑکے کی چاہ میں سات لڑکیاں جننا۔ اس عورت کا کوئی نام نہیں تھا۔ رشتے میں یہ بیلی رام کی گھر والی اور مکوڑے کی ماں تھی۔

مکوڑے کی سات بہنوں کا ذکر بیکار ہے۔ ویسے ہی کہانی لمبی ہو جائے گی۔ اب نہ تو بیلی رام کی طرح ساری رات کہانی سنانے والا ہے نہ سننے والے۔ وہ سب ہی گھر سے چیونٹیوں کی طرح نکلیں اور چیونٹیوں کی طرح رینگتی ہوئی آس پاس کے دیہاتوں میں گم ہو گئیں۔ وہاں انہوں نے ان گنت چیونٹیوں کی اور

چوتھی جماعت میں مکوڑے کو پتہ چلا کہ وہ واقعی کیڑا مکوڑا ہے۔ اسکول میں رنگین کرتہ پہن کر آیا تھا۔ لمبا رنگین کرتا کئی رنگ کی کترنوں سے بنا تھا۔ حالانکہ ماں نے بہت قرینے سے ان کترنوں کو سجایا تھا، ملتے جلتے رنگ کی کترنوں کو بہت جتن سے سیا تھا۔ دوپہر کے انٹرول میں ایک لڑکے سے مذاقاً چھیڑ دیا۔ ''یہ بیچ کا کپڑا تو میری قمیض کا ہے۔'' بس پھر کیا تھا، سب ہی نے اس کے کرتے میں اپنی یا اپنے خاندان کی کترنیں ڈھونڈھ لیں۔ کچھ منچلوں نے مست رام کو ہی نہیں بلکہ بیلی رام کو 'چور چور' کہا۔ کچھ نے کرتا کھینچ لیا۔ نیا کرتا دونوں کناروں سے پھٹ گیا جس سے مکوڑے کا ویسا ہی رنگین کچھا نظر آنے لگا۔ وہ اسکول سے بھاگ آیا اور دوبارہ کبھی نہیں گیا۔ بیلی رام تو اپنے میں مست رہتا تھا۔ ماں نے سمجھایا پڑھنا ضروری ہے۔ مکوڑا نہیں مانا۔

پنیری تیار کی۔ ہاں! اپنے منہ میں دانہ بھر کر ٹھکانے کی طرف چلنا یہیں سیکھ لیا تھا۔ اب رہا مکوڑا۔ مست رام جب مکوڑا تھا، بے عیب تھا، بھولا بھالا، سیدھا سادھا سات بیٹیوں کے بعد لاڈلا بیٹا۔ بھائی باپ کی خصوصیات اس میں کب دھیرے دھیرے سماتی گئیں، پتہ نہیں چلا۔ ماں کے کماؤ اور سیدھی سادی گائے سی ہوتے ہوئے اس پر دودھ کا اثر کم ہوا۔

چوتھی جماعت میں مکوڑے کو پتہ چلا کہ وہ واقعی کیڑا مکوڑا ہے۔ اسکول میں رنگین کرتہ پہن کر آیا تھا۔ لمبا رنگین کرتا کئی رنگ کی کترنوں سے بنا تھا۔ حالانکہ ماں نے بہت قرینے سے ان کترنوں کو سجایا تھا، ملتے جلتے رنگ کی کترنوں کو بہت جتن سے سیا تھا۔ دوپہر کے انٹرول میں ایک لڑکے سے مذاقاً چھیڑ دیا۔ ''یہ بیچ کا کپڑا تو میری قمیض کا ہے۔'' بس پھر کیا تھا، سب ہی نے اس کے کرتے میں اپنی یا اپنے خاندان کی کترنیں ڈھونڈھ لیں۔ کچھ منچلوں نے مست رام کو ہی نہیں بلکہ بیلی رام کو 'چور چور' کہا۔ کچھ نے کرتا کھینچ لیا۔ نیا کرتا دونوں کناروں سے پھٹ گیا جس سے مکوڑے کا ویسا ہی رنگین کچھا نظر آنے لگا۔ وہ اسکول سے بھاگ آیا اور دوبارہ کبھی نہیں گیا۔ بیلی رام تو اپنے میں مست رہتا تھا۔ ماں نے سمجھایا پڑھنا ضروری ہے۔ مکوڑا نہیں مانا۔ بیلی رام نے سمجھایا: 'اپنا ہنر سیکھ لے۔ بھوکا نہیں رہے گا۔ گھر بیٹھے روٹی کمائے گا، کہیں بھی جانے کی ضرورت نہیں۔ لوگ خود ہی تیرے گھر کے چکر لگائیں گے۔ ویسے بھی گاؤں بھر کے تیوہار اور دوسرے دنوں میں کئی چیزوں کے علاوہ فصل کا حصہ تو ملتا ہی ہے۔ زیادہ کام ہونے پر کسی کے گھر چلے جاؤ۔ کام اس کی مرضی کا کرو اور بھر پیٹ کھاؤ۔'

مکوڑا گاؤں کی گلیوں میں گھومتا، لوگوں کے کپڑے لاتا اور لے جاتا ہوا بڑا ہو گیا۔ زمانہ خراب موسم کی طرح بدلنے لگا تھا۔ باپ کا کام ویسا نہیں رہا، وہ عزت بھی نہیں رہی، ریودار، کلی دار پاجامہ، کمری کا زمانہ جاتا رہا۔ کوٹ، بشرٹ، پینٹ بننے لگے۔ پاجامہ بھی پینٹ کٹ پہنا جانے لگا۔ مجھے ہنر سیکھنے کے لئے باہر بھیجو باپو۔ اب نیا ہنر سیکھنا پڑے گا۔ مکوڑے نے کہا تو بیلی رام نے کان نہیں دھرے۔ ایک دن علیٰ الصبح گھر سے نکل پانچ بجے کی گاڑی میں بیٹھ کر بھاگ گیا مکوڑا۔

مکوڑے کے گھر سے بھاگنے سے بیلی رام بے چین ہو گیا۔ اکیلا کہاں گیا ہوگا۔ بیلی رام کئی دن حیران و پریشان رہا۔ شاید وہ ماں کو بتا کر گیا تھا۔ اسی لئے وہ روئی نہیں۔ اس بات کا جھگڑا کئی دن چلتا رہا۔ بیلی رام گھر والی کو کوستا رہا۔ ایک دن مکوڑے کا خط آیا، پٹھان

کوٹ سے۔ وہ ایک مشہور درزی کے یہاں اپنے ہنر کو نکھار رہا تھا۔ خط لکھنے والے نے آدھی بات اپنی اور آدھی مکوڑے کی لکھی تھی۔

''میں خیریت سے ہوں۔ امید ہے آپ بھی شری چامنڈا کی مہربانی سے بخیریت ہوں گے۔ خبر یہ ہے کہ مست رام آج کل پٹھان کوٹ کے مانے ہوئے استاد کے پاس کوٹ بنانا سیکھ رہا ہے۔ آپ سب سے ملنے مست رام یہاں آ گیا ہے اس لئے وہ بہت شرمندہ ہے۔ اسے معاف کریں۔ چھوٹوں کو معاف کرنا بڑوں کا کام ہے۔ ایک دن وہ ایسا ہنر اپنے ہاتھ سے سیکھ کر آئے گا کہ آپ سب کو تار دے گا۔ لکھنے والے کی طرف سے پڑھنے والوں کو آداب، زیادہ کیا لکھوں، خط کا جواب دیں۔''

خط سن کر بیلی رام کا سینہ پھول گیا۔ اب وہ پورے جوش وخروش اور کھلے دل سے کہانیاں سنانے لگا۔ ساتھ ہی ساتھ آس پاس کے دیہاتوں میں شیخی بگھارتا ہوا مکوڑے کے لئے مکوڑی بھی ڈھونڈھتا۔

مکوڑا پورے دو سال تک گھر نہیں آیا۔ کبھی کبھی خط بھیجتا۔ اب اس نے پینٹ سینی سیکھ لی ہے، اب بشرٹ، اب کوٹ۔ ایک دو بار اس ماں کو دس دس روپئے بھی بھیجے۔

تنگ آ کر بیلی رام نے خط لکھوایا:

''اگر بیٹھے ہو تو کھڑے ہو جاؤ، کھڑے ہو تو راستہ پکڑے لو۔ تمہاری ماں سخت بیمار ہے۔ خط کو تار سمجھ کر گھر چلے آؤ۔''

مکوڑا ماں کے نام پر کاریگر مست رام بن کر لوٹا۔ ساتھ میں ایک مشین بھی لایا جو استاد نے اسے خوش ہو کر دی تھی۔

پٹھان کوٹ سے لوٹنے پر مست رام بے عیب نہ رہا۔ اسے افیم کی لت پڑ گئی تھی۔ ماں تو گھر میں ٹھیک ٹھاک تھی۔ وہ واپس جانا چاہتا تھا کہ بیلی رام نے اسے سبز باغ دکھا کر جانے نہیں دیا۔ اس نے مست رام کے بیاہ کی تاریخ پکی کر دی۔ سوچا کہ شاید شادی کے بعد مست رام کی افیم کی لت چھوٹ ہی جائے گی۔

لیکن شادی کے بعد بھی مست رام کی افیم کی لت نہ چھوٹی۔ اس زمانے میں افیم بارہ میل دور کی ایک دکان سے مل جاتی تھی۔ افیم نہ ملنے پر وہ بھنگ پینے لگا۔ اسے گھروں کے پچھواڑے یا کھیتوں میں بھنگ ملتے ہوئے دیکھا جا سکتا تھا۔

مست رام کے پاس کپڑے کم آتے تھے حالانکہ وہ دور دور تک کاریگر مشہور ہو گیا تھا۔ جو کپڑے آتے بھی وہ انہیں مہینوں رکھے رہتا۔ یہ تو خوش قسمتی سے گھر والی کو سینا پرونا آتا تھا۔ اس نے اپنی ساس سے بھی ہنر سیکھا تھا۔ مست رام تو کاٹھ کے گھوڑے کی کہانی لگاتار سناتے جاتا۔ مست رام کے راجکمار کو لے کر گھوڑا کسی اجنبی ملک میں پہنچ جاتا۔ کبھی ایسے ملک میں جہاں خوش حالی ہوتی اور کبھی ایسے ملک میں جو قحط کا شکار ہوتا اور کبھی ایسی منحوس جگہ جہاں کاریگروں اور مزدوروں کی قدر نہیں ہوتی۔

کاریگر ہونے کے باوجود گاؤں میں عزت نہیں تھی مست رام کی۔ لوگ اب ہاٹ بازاروں میں کپڑے سلنے کے لئے دینے لگے تھے۔ جو گھر میں بیٹھ کر کپڑے سلتے ہیں وہ ماسٹر نہیں ہوتے۔ جیسے گاؤں میں جو رہے وہ ترکھان بازار میں جائے تو مستری اور شہرے میں جائے تو راج مستری۔ دوست کہتے، بازار میں ایک درزی نے دکان کھولی تھی جس کے پاس کام ہی کام تھا۔ تو تو کاریگر ہے، پٹھان کوٹ سے سیکھا ہوا۔ تیرے تو وارے نیارے ہو جائیں گے وہاں۔ گاؤں والوں نے سمجھایا۔

مرغی کے پنکھوں جیسے گھر سے باہر نکلنے کو جی نہیں چاہتا تھا مست رام کا۔ گھر اور گاؤں نے ایک طلسمی جال سا پھینک رکھا تھا اس پر۔ بھنگ پینے پر وہ اس جال میں ایک یوگی کی طرح مقیم ہو جاتا۔

کہانی میں اپنی طرف سے کئی پھل کلیاں بھی جوڑ دی تھیں مست رام نے۔ کہانی سے پہلے وہ دن میں ملی ہوئی بھنگ چلم میں بھر کر لمبے سونٹے لگاتا ہوا کہانی کو دھوئیں کی طرح لمبی اور طلسمی بناتا جاتا۔ سردیوں کی رات اور مست رام کی کہانی ختم ہونے میں نہیں آتی تھی۔

جب بیلی رام کے بعد مست رام نے گدی سنبھالی تو سماں بدل چکا تھا۔ اب کہانیاں سنانے والے کم رہ گئے تھے۔ سب اپنے اپنے کام میں مصروف۔ گاؤں والوں نے باہر جا کر نوکریاں کر لیں۔ اس جیسے بیکار اب کم ہی تھے۔ دن بھر ملازمت کرنے کے بعد لوٹنے پر رات کو ان میں کہانی سننے کی سکت نہیں رہتی تھی۔ کوڑے میں بکھرے چھوٹے چھوٹے بیکار برتنوں کی طرح چھوٹے چھوٹے سکھ بھی بکھرنے لگے۔

کاریگر ہونے کے باوجود گاؤں میں عزت نہیں تھی مست رام کی۔ لوگ اب ہاٹ بازاروں میں کپڑے سلنے کے لئے دینے لگے تھے۔ جو گھر میں بیٹھ کر کپڑے سلتے ہیں وہ ماسٹر نہیں ہوتے۔ جیسے گاؤں میں جو رہے وہ ترکھان بازار میں جائے تو مستری اور شہرے میں جائے تو راج مستری۔ دوست کہتے، بازار میں ایک درزی نے دکان کھولی تھی جس کے پاس کام ہی کام تھا۔ تو تو کاریگر ہے، پٹھان کوٹ سے سیکھا ہوا۔ تیرے تو وارے نیارے ہو جائیں گے وہاں۔ گاؤں والوں نے سمجھایا۔

مرغی کے پنکھوں جیسے گھر سے باہر نکلنے کو جی نہیں چاہتا تھا مست رام کا۔ گھر اور گاؤں نے ایک طلسمی جال سا پھینک رکھا تھا اس پر۔ بھنگ پینے پر وہ اس جال میں ایک یوگی کی طرح مقیم ہو جاتا۔

جب سارے گھروں کے دروازے یکے بعد دیگرے بند ہوتے گئے، پچھواڑے کی بھانگ ہی اس کا مقدر رہی تو مست رام نے 'شبھ مہورت' نکال کر مشین بازار میں لا پٹکی اور ایک پھٹے پر لکھوا دیا ''وشوکرما ٹیلر ماسٹر''

❑❑❑

غزل

میں ایک رستہ ہوں، بھولا ہوا، محبت کا
مری تلاش میں ہے قافلہ محبت کا

زبان اینٹھ گئی، روح تلملا اٹھی
ہے ناگوار بہت، ذائقہ محبت کا

نظر جھکا کے ادب سے گزر گئے ہم لوگ
اگر ہوا ہے کبھی سامنا محبت کا

قدم قدم پہ ہے اب تو سوال سود و زیاں
وہ دن بھی تھے کہ کوئی غم نہ تھا محبت کا

مرے وجود کی سنسان رہ گزر مہکی
گلاب، ذہن میں جب بھی کھلا محبت کا

ہوا ہے تیز، بہت تیز اور ہتھیلی پر
جلائے پھرتا ہوں میں اک دیا محبت کا

ترے شباب کو کیسے نشاطِ جاں لکھوں
قلم کی نوک پہ ہے مرثیہ محبت کا

گمانؔ، پہلے طبیعت کو رام کر لینا
کبھی مزاج اگر پوچھنا محبت کا

گمانؔ انصاری
مئوناتھ بھنجن
موبائل: 9807490442

غزل

وحشت کا امکان بہت ہے
دشت، جنوں سامان بہت ہے

چہرے پر شاداب تبسم
لیکن دل ویران بہت ہے

ابن آدم کی فطرت میں
عجلت کا رجحان بہت ہے

شہر خود کے باشندوں میں
جذبوں کا فقدان بہت ہے

فصل بہاراں کی آمد کا
زخموں کو ارمان بہت ہے

میرے گھر کی ویرانی پر
صحرا بھی حیران بہت ہے

اردو نثر و نظم پہ عزمیؔ
غالبؔ کا احسان بہت ہے

رفعت عزمیؔ
حبیب کدہ، ۱۰۵، قصیانہ، ردولی ضلع فیض آباد
موبائل: 9451818310

ایندھن

حمید دلوائی
۱۹۳۲ ۱۹۷۷

حامد عمر دلوائی مراٹھی زبان کے مقبول ادیبوں میں شمار ہوتے ہیں۔ انہوں نے مراٹھی زبان میں کئی ناول لکھے۔ مراٹھی کے علاوہ ان کی انگریزی میں بھی کچھ کتابوں شائع ہو چکی ہیں۔ مراٹھی اور انگریزی زبان پر انہیں یکساں مہارت حاصل تھی۔ ہندوستانی مسلمانوں کے تہذیبی اور سماجی مسائل پر مبنی ان کی کئی کتابیں مراٹھی زبان میں شائع ہو چکی ہیں۔ انہوں نے بحیثیت صحافی اپنے کیریئر کی شروعات کی تھی۔ وہ سیاست میں بھی سرگرم رہے۔ انڈین سوشلسٹ پارٹی کے نمایاں لیڈر کے طور پر بھی انہوں نے اپنی شناخت قائم کی۔ اپنی محض ۴۴ سالہ زندگی کا کافی بڑا عرصہ انہوں نے مسلم طبقہ بالخصوص مسلم عورتوں کی تعلیمی پسماندگی کو دور کرنے میں صرف کیا۔

اردو کے ادبی رسالوں میں عام طور پر روسی، انگریزی اور دیگر یورپی زبانوں کی تصنیفات نظر آجاتی ہیں لیکن اردو ہندی کے علاوہ ہندوستان کی دوسری زبانوں کے ادب کے تراجم شائع کرنے کا رواج ذرا کم ہے۔ ہماری کوشش رہے گی کہ 'نیا دور' کے ہر شمارے میں ہندوستانی زبانوں کے نمائندہ ادب پاروں کے ترجمے پیش کئے جائیں۔ اسی سلسلہ کی تیسری کڑی کے طور پر مراٹھی زبان کے مشہور ادیب حمید دلوائی کے ناول 'ایندھن' کی تیسری قسط شائع کی جارہی ہے۔

(ایڈیٹر)

اگلے دن میں کلواڑیوں کی بستی میں گیا۔ پندرہ سال پہلے مجھ سے صلاح لینے آنے والے بعض کلواڑیوں سے میری ملاقات ہوئی۔ اس بستی کو بھی میں برسوں بعد دیکھ رہا تھا۔

اس بستی میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی تھی۔ وہی چھپروں والے گھر، وہی دیواروں پر کھونٹوں سے لٹکے ہوئے ہل اور پھالیاں اوسارے میں بندھے ہوئے مویشی، پہلے کی طرح لنگوٹ باندھے کلواڑی۔

میں وہاں پہنچا تو چار پانچ لوگ اپنے برآمدے میں بیٹھے چلم پی رہے تھے۔ میرے آنے پر بستی میں مجھے کوئی خاص ہلچل نہیں دکھائی دی۔ وہ اپنی جگہ سے ہلے تک نہیں، نہ اٹھ کر آگے آئے، نہ کسی نے مجھے بیٹھنے کو کہا۔ انہوں نے مجھ سے کوئی بات نہ کی۔ مجھے نظر انداز کر کے آپس میں بات کر رہے تھے۔

میں کچھ دیر ان کے گھروں کے سامنے یونہی کھڑا رہا۔ بہت عجیب لگ رہا تھا لیکن آخر کار میں نے خود آگے بڑھنے کا فیصلہ کیا۔ میں نے ان میں سے ایک کو پکارا اور اس سے کہا، 'مجھے تم لوگوں سے کچھ بات کرنی ہے۔' اور خود ہی ایک گھر کے برآمدے میں قدم رکھا۔ اس دوران گھر کے مالک نے وہاں پڑی ایک گھونگھڑی بائیں ہاتھ سے اٹھا کر بے پروائی سے آگے اچھال دی۔ میں اسے بچھا کر اس پر بیٹھ گیا۔ وہ لوگ خاموشی سے آکر میرے گرد بیٹھ گئے۔

ایک بار پھر بات کا آغاز میں نے کیا۔ ہم سب کو ایک گاؤں میں رہنا ہے، ہم سب کو ایک دوسرے کی ضرورت پڑے گی، یوں آپس میں لڑائی جھگڑا کریں گے تو کیسے گزارہ ہوگا؟ میں نے اس قسم کا لہجہ اختیار کیا اور ان سے یہ ساری باتیں کہہ دیں۔

پہلے وہ چپ چاپ میری باتیں سنتے رہے۔ پھر وہ بولنے لگے۔ ایک کے بعد ایک، ہر ایک اپنے لہجے میں، اپنی اپنی آواز میں لیکن ان میں سے ہر ایک کی آواز میں ایک جیسا کڑک پن تھا جس کی میں توقع نہیں کر رہا تھا۔ مجھے ان کے لہجے کے اس کڑے پن نے چونکا دیا۔ وہ جھگڑا نمٹانے پر آمادہ نہ تھے۔ کسی بات کے لئے تیار نہ تھے۔ وہ نہ کچھ کہنا چاہتے تھے اور نہ کسی کی بات سننے پر راضی تھے۔ آخر میں نے دلیل کا سہارا لیا۔

'کیا تم لوگ اپنے مویشی ہماری چراگاہ میں لائے تھے؟' میں نے ان سے پرسکون لہجے میں سوال کیا۔

'ہاں، ہاں۔ لائے تھے'، کئی گستاخ، بے پروا آوازوں نے جواب دیا۔

'اور میرے بھائی نے تمہیں گالیاں دیں، یہی نا؟'

'لیکن کیوں؟ اس نے گالیاں کیوں دیں؟ ہماری ماں بہنوں کی بے عزتی کیوں کی؟'

'اس نے غلط کیا لیکن تم اپنے مویشی وہاں کیوں لائے؟'

'گھاس والی زمین جو ہوئی، اچھی چراگاہ ہے۔ چار مویشی وہاں چلے گئے تو کیا ہو گیا؟'

'ایسا کیسے؟ یہ تم لوگوں نے غلط کیا، یہ قاعدے

کے خلاف ہے۔'

مگر وہ لوگ قاعدہ قانون ماننے کے موڈ میں نہیں تھے۔ کسی اور کی چراگاہ میں اپنے مویشی لے جانے سے کوئی قاعدہ ٹوٹتا ہے، یہ ان کے ذہن میں ہی نہ آیا تھا۔

'تو اب کیا کیا جائے؟ یہ معاملہ سلجھا لیتے ہیں۔'

'مطلب، کیا کرنا ہوگا؟'

'بھائی کو اپنی غلطی ماننی چاہئے کہ اس نے تمہیں گالیاں دیں اور تم لوگ اسے مارنے کو دوڑے، تمہیں اس پر افسوس ظاہر کرنا چاہئے، بس'

'نہیں!' میرے تجویز کئے ہوئے سمجھوتے کو انہوں نے مسترد کر دیا۔ ان کی آوازوں میں ایسی بے نیازی تھی کہ میں چونک پڑا۔ انہوں نے کہا، 'اپنے بھائی کو معاملہ آگے لے جانے دو، ہم اس کا سامنا کریں گے۔'

میں سمجھ گیا کہ اور کچھ کہنا لاحاصل ہے اور مایوسی سے اٹھ کر واپس چل دیا۔ جاتے ہوئے میں نے ایک بار بھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔

کلواڑیوں کے گھر نہیں بدلے، انہوں نے لنگوٹ باندھنا بھی نہیں چھوڑا لیکن انہوں نے اپنی تنظیم بنالی ہے، ہزاروں روپئے کا چندہ جمع کر لیا ہے۔ چلتے ہوئے مجھے کسی کی بتائی ہوئی یہ بات یاد آئی۔ جب گھر لوٹا تو میرے دماغ میں صرف اتنی ہی بات رہ گئی تھی۔

اس واقعہ کے بعد معاملہ خود میرے ہاتھوں سے نکل کر دوسرے کے ہاتھوں میں چلا گیا۔ میں دوبارہ صبح شام کھیتوں پر منڈلاتے ہوئے کہرے پر نگاہ جمائے، پچھواڑے کے آنگن میں بیٹھا رہنے لگا اور ادھر کلواڑیوں پر مقدمہ کرنے کی تیاریاں شروع ہوگئیں۔

اپنی مخصوص جگہ بیٹھے بیٹھے میں بدلتے ہوئے موسم کے گرفت میں نہ آنے والے تغیرات کا مشاہدہ کرتا رہا۔ میں دبی ہوئی ہوا میں ہر روز پھر سے جان پڑتے اور منڈلاتے ہوئے کہرے کو میلوں دور اڑا لے جاتے دیکھا کرتا۔ واششٹھی ندی کا پاٹ ان دنوں میں پتلا اور چوڑا، کمزور اور منھ زور ہوتا رہا۔ کنارے پر بالو کے ٹیلوں نے کئی اپنی جگہ بدلیں۔ کبھی وہ پہاڑی کی طرح اونچے ہو جاتے اور کبھی غائب ہو جاتے۔ انہیں دیکھتے ہوئے مجھے احساس ہونے لگا کہ میں ایک ہی جگہ پر بیٹھا ہوا ہوں اور دنیا آگے چل رہی ہے۔ پچھلے پندرہ سال یہی ہوتا رہا ہے۔ دوسروں سے قدم ملا کر چلنے کی طاقت مجھ میں نہیں رہی۔

آگے پیش آنے والے واقعات بہت تیزی سے ہوئے۔ بھائی نے پولیس میں شکایت درج کرائی، پھر کلواڑیوں کا تھانے میں آنا جانا ہوتا رہا۔ بھائی اور ان کے مزدوروں نے اپنے بیانات دئے اور میں پچھواڑے کے آنگن میں الگ تھلگ بیٹھا، گویا غیر جانبداری سے، ان سب واقعات کا جائزہ لیتا رہا۔

اور اچانک واقعات کا یہ سلسلہ بالکل ختم ہو گیا! بھائی نے اپنے ساتھ ہونے والی مار پیٹ کے لئے ڈاکٹری سرٹیفکٹ حاصل کیا۔ ان کے مزدوروں کی گواہیوں نے بھی اس کی تائید کی۔ یہی نہیں، بلکہ انہوں نے یہ تک کہا کہ کلواڑیوں نے اس زمین کا مالک ہونے کا دعویٰ کیا اور زمینداروں کو وہاں سے نکال دینے کی بات کی۔ مجھے حیرت سے دھکا سا لگا۔ یہ بات سچ نہ تھی لیکن بھائی کلواڑیوں کے بھاگنے کے لئے کوئی راستہ نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ اس سفید جھوٹ نے میری غیر جانبداری کو ختم کر دیا۔ میں نے بھائی کو اس سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ کلواڑیوں نے ان مزدوروں کو اپنے بس میں کرنے کی کوششیں کیں، لیکن انہیں توڑ نہ سکے۔ آخر مقدمہ عدالت میں پیش ہوا، تب کلواڑیوں نے ناچار بھائی سے معافی مانگی اور اس نے مقدمہ واپس لے لیا۔

ان سب واقعات سے میری حالت مضحکہ خیز ہو گئی۔ بھائی اور دوسرے مسلمان اور شیر ہو گئے۔ جب بائی مجھے کلواڑیوں کے معافی مانگنے کی خبر سنانے پچھواڑے کے آنگن میں آیا تو اس کی آنکھوں میں جھلکتے جیت کے گھمنڈ نے مجھے بے چین کر دیا۔ وہ بازار سے بوندیاں لایا تھا۔ میں وہ بوندیاں لے کر آہستہ آہستہ کھانے لگا۔ بوندیاں لذیذ تھیں، گرما گرم۔ میں وہیں اپنی جگہ بیٹھا رہا اور دنیا مجھ سے آگے ہی آگے چلتی رہی۔

اس کے تین چار دن بعد سمتی ہمارے گھر آئی۔ کلواڑیوں کے اس معاملے کے اچانک پھوٹ پڑنے سے میں اسے لگ بھگ بھول ہی گیا تھا۔ جب وہ آئی تب میں باورچی خانے میں بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ بھابی مٹر چھیل رہی تھی۔ میں نے سمتی کی طرف ایک نگاہ ڈالی اور پھر چائے پینے لگا۔

اس روز وہ کچھ الگ کیفیت میں دکھائی دی۔ سنجیدہ تھی۔ کچھ دیر ساکت سی دروازے میں کھڑی رہی۔ اسی بیچ بھابی نے اسے بیٹھنے کہو کہا اور چائے کے لئے پوچھا۔ اس نے سر ہلا کر انکار کر دیا۔ میرے چائے ختم کرتے ہی اس نے مجھ سے پوچھا۔ 'ذرا باہر آؤ گے۔ تم سے کچھ کام ہے۔'

میں خاموشی سے اس کے ساتھ پچھواڑے میں آ گیا۔

'آج شام کو گھر آؤ گے؟' اس نے مجھ سے پوچھا۔

'کس لئے' میں نے حیرت سے کہا۔

'مجھے تم سے کچھ کہنا ہے۔'

'کیا ہے؟ یہیں کہہ دو۔'

'نہیں! تمہیں گھر آنا پڑے گا، شام کو یا بلکہ رات کو۔'

کچھ لمحے میرے ذہن میں خیالوں کی لہریں اٹھتی رہیں، میں کچھ جواب دئے بغیر گنگ سا اس کے سامنے کھڑا رہ گیا۔ وہ دوبارہ بولی، 'آج دوپہر مجھے بازار جانا ہے۔ لوٹتے ہوئے دیر ہو جائے گی۔ اس لئے شام کو دیر سے آنے کے لئے کہہ رہی ہوں۔ تمہیں خواہ مخواہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔'

میں نے آنے کا وعدہ کرلیا اور وہ باہر ہی سے چلی گئی۔ جب میں باورچی خانے میں واپس آیا تو بھابی نے پوچھا، 'سمتی نے کیوں بلایا ہے؟'

'رات کو گھر آنے کو کہا ہے۔'

'رات کو؟' اس نے پوچھا۔ اس کے معنی خیز لہجے سے مجھے تکلیف ہوئی۔ میں نے اس سے کہا، 'ایسی کوئی بات نہیں ہے، بھابی! آج وہ کچھ فکرمند دکھائی دے رہی تھی۔'

'ہاں، میں نے بھی دیکھا، میں برا نہیں مانتی لیکن آپ وہاں مت جایئے۔ اگر ان کو پتہ چل گیا تو خواہ مخواہ آپ لوگوں میں پھر جھگڑا ہوگا۔'

اس کا یوں میری راہ روکنا مجھے اچھا نہیں لگا۔ میں نے کہا، 'جھگڑا کیوں ہوگا؟ میری مرضی۔ اگر میں اس سے ملوں تو کسی اور کو کیا غرض؟'

میری یہ نرم دلیل اس کے گلے اتر گئی۔ وہ مسکرا کر بولی، 'اگر آپ نے جانے کا ارادہ کر لیا ہے تو جایئے، آپ کو روکنے سے کیا ہوگا۔'

اس رات میں سمتی کے گھر گیا۔ وہ برآمدے میں بیٹھی بیتابی سے میری راہ دیکھ رہی تھی۔ میرے پہنچتے ہی وہ مجھے رسوئی گھر میں لے گئی اور کچھ کہے بغیر چائے کا پانی رکھ دیا۔ میں عجیب سا ایک جگہ بیٹھا رہا۔ اس کے ہاتھ سے چائے لے کر پی، پیالی نیچے رکھی اور پاگلوں کی طرح چپ چاپ بیٹھا رہا۔

پھر اس نے بولنا شروع کیا۔

وہی بولتی رہی، میں سن رہا تھا، سنتا رہا، اس کے لفظ برسات کے بعد کی واششٹھی ندی کے منہ زور پانیوں کی طرح بہہ رہے تھے۔ بیچ کے وقفوں میں آنگن سے آتی سوکھے پتوں کی سرسراہٹ سنائی دیتی رہی۔ باتوں کے دوران اچانک جذبات کے بھنور پڑنے لگتے اور لفظوں کا بہاؤ ٹوٹ جاتا۔ پھر مجھے اس کی متواتر سسکیاں سنائی دینے لگیں۔ اس کی آواز تھمے ہوئے آنسوؤں جیسی ہوگئی اور لفظوں کی تصویریں دھندلی پڑ گئیں۔ اس کے لفظوں سے ایسے بھیانک معنی ظاہر ہونے لگے جیسے رسوئی گھر کی دیواروں پر چلتی ہوئی چھپکلیوں کی سرسراہٹ۔

اسی پل میرے ذہن پر نقش سمتی کی تصویر چکنا چور ہوگئی۔ اس شکستہ تصویر میں سے پہلے والی سمتی کا ڈھانچہ جھانکنے لگا۔ یہ تصویر اسی کے لفظوں سے بنی تھی۔ اس نے بنائی تھی اور اسی کے ہاتھوں سے چور چور ہوگئی۔

میرا بھائی پہلے اسکول میں پڑھایا کرتا تھا۔ سمتی اس کی شاگرد تھی۔ میں یہ بات جانتا تھا لیکن اپنے لفظوں میں سمتی نے اپنے اور اس کے پیچیدہ تعلق کے ایسے دھاگے بنے جن سے میں قطعی ناواقف تھا۔ اس نے سمتی کو اسی وقت راستے پر ڈال دیا تھا جب وہ اسکول میں پڑھتی تھی۔ اس نے اسے بہلا پھسلا کر اس بے باک تعلق میں گھیر لیا تھا، تب اس کی عمر پندرہ سولہ سال کی تھی۔ تب سے ان کے تعلقات اسی طرح کے رہے تھے۔ معصومیت میں قائم کئے جانے والے اس جنسی تعلق سے سمتی بدل کر رہ گئی تھی۔ اس کے سامنے لاچار ہوگئی اور لاچار ہی رہی۔ ہمیشہ اس کی خواہش کے سامنے سر جھکا دیتی جیسے ایسا نہ ہونا اب اس کے بس میں نہ رہا تھا۔

میرا بھائی پہلے اسکول میں پڑھایا کرتا تھا۔ سمتی اس کی شاگرد تھی۔ میں یہ بات جانتا تھا لیکن اپنے لفظوں میں سمتی نے اپنے اور اس کے پیچیدہ تعلق کے ایسے دھاگے بنے جن سے میں قطعی ناواقف تھا۔ اس نے سمتی کو اسی وقت راستے پر ڈال دیا تھا جب وہ اسکول میں پڑھتی تھی۔

اس نے اسے بہلا پھسلا کر اس بے باک تعلق میں گھیر لیا تھا، تب اس کی عمر پندرہ سولہ سال کی تھی۔ تب سے ان کے تعلقات اسی طرح کے رہے تھے۔ معصومیت میں قائم کئے جانے والے اس جنسی تعلق سے سمتی بدل کر رہ گئی تھی۔ اس کے سامنے لاچار ہوگئی اور لاچار ہی رہی۔ ہمیشہ اس کی خواہش کے سامنے سر جھکا دیتی جیسے ایسا نہ ہونا اب اس کے بس میں نہ رہا تھا۔

جذبات کے اس بہاؤ میں سمتی اپنے ذہن کا توازن کھو بیٹھی۔ وہ مجھ سے اپنے پہلے جنسی تجربے کا بیان کرنے لگی جسے سن کر میں تھرا اٹھا۔ جب اس نے اپنا بیان پورا کیا تو تھک کر یوں دیوار سے سر ٹکا لیا جیسے ابھی ابھی اس جنسی تجربے سے باہر نکلی ہو۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی دھاریں بہنے لگیں اور وہ گویا دوبارہ شعور کی حالت میں واپس آ گئی۔

مجھ سے کچھ کہا نہ گیا۔ بس بیٹھا چھپکلیوں کی چک چک سنتا رہا۔ باہر ہوا چلنے سے سوکھے پتوں کے سرسرانے کی آواز مجھے دلاسہ دے رہی تھی۔

اگلے دن بھابی نے مجھ سے پوچھا:

'سمتی نے کیا بتایا؟'

اس نے یہ سوال بہت ہی سرسری لہجہ میں پوچھا تھا لیکن مجھے لگا کہ اس سوال کے پیچھے اس کا کوئی پوشیدہ مقصد ہے۔ میں رات کو جب گھر لوٹا تو اسی نے میرے لئے پیچھے کا دروازہ کھولا تھا۔ تب وہ آدھی نیند میں تھی۔ اس نے صرف اتنا پوچھا کہ کیا بجا ہے اور میرے کہنے پر کہ ایک بجا ہے، اس نے کہا تھا، 'کتنا وقت لگا دیا آپ نے!' اور وہاں سے چلی گئی تھی لیکن اس وقت زیادہ سوال جواب کرنا شاید اسے ٹھیک نہیں لگا ہوگا اور اگر اس نے کچھ پوچھا بھی ہوتا تو میں اسے کچھ بتانے کی کیفیت میں نہیں تھا۔ سمتی کی باتوں نے مجھ پر مارفین جیسا اثر کیا تھا۔ میرے ذہن کی حسیں سُن ہوگئی تھیں۔ اس کے گھر سے نکلتے ہوئے اس سے یہ تک کہنے کا مجھے ہوش نہ تھا۔

میں نے بھابی کو جواب دیا، 'اس نے وہی بتایا جو ہم لوگوں کو معلوم ہے۔'

'پھر اس کے لئے آپ کو رات کے وقت بلانے کی کیا ضرورت تھی؟'

'شاید اس لئے کہ بھائی کو پتہ نہ چلے۔'

'ان کو وہ خود بتائے گی۔' اس نے کہا۔ 'آپ خبردار رہئے گا، اس کے گھر مت جایا کیجئے۔ ایک بار گھر میں تماشا ہو چکا ہے، معلوم ہے نا؟ ایسا پھر سے نہیں ہونا چاہئے۔'

لیکن میرے ذہن پر اب تک اس مارفین کا غلبہ تھا اور مجھے اس اپدیش کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ میں اگلے کئی دن اس کیفیت سے باہر نہ نکل سکا۔ اس میں مجھے صرف سمتی دکھائی دیتی رہی، جذبات سے عاری، محض خواہشات کی زد میں آیا ہوا ایک بدن۔ وہ ہوس کے اس حملے سے سنبھلنے کی کوشش کر رہی تھی۔ میرا سہارا لینے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کی اس تکرار سے مجھے محسوس ہوا کہ اسے صرف کوئی ہمدرد سننے والا چاہئے تھا۔

'تمہیں معلوم ہے کلواڑیوں نے تمہارے بھائی پر حملہ کیوں کیا تھا؟' ایک رات اس نے مجھ سے پوچھا۔

اس کے ساتھ تنہائی میں بیٹھنے سے مجھے عجیب لگتا تھا۔ آنگن سے کوئی گزرتا تو سوکھے پتے چرچرانے لگتے۔ مجھے خوف ہوتا کہ کوئی مجھے اس کے گھر میں آتے جاتے دیکھ لے گا۔ اسے محسوس ہو گیا کہ میرا دھیان اس کی باتوں کی طرف نہیں ہے۔ 'آنگن میں سے تو بہت سے لوگ گزرتے رہتے ہیں،' اس نے مجھے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ پھر اس نے اپنا وہی سوال دہرایا۔

میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

'میرے چچیرے بھائی کے کہنے پر۔ یہ تم اپنے بھائی سے کہہ دینا، اسے خبردار کر دینا!'

یہ اطلاع میرے لئے نئی تھی۔ اب تک میرا خیال یہ تھا کہ جھگڑا مویشیوں کے چراگاہ میں آنے پر ہوا تھا لیکن میں بھائی کو کیونکر خبردار کر سکتا تھا؟ اسے تو اس کا یقینا اندازہ ہوگا! دراصل اس معاملے میں صرف میں ہی بے بس تھا۔ میں وہ جھگڑا نہیں سلجھا سکا تھا اور مجھے یقین نہیں تھا کہ بھائی میری بات پر کان دھرے گا۔ 'اب بھی تمہارا دل اسی میں اٹکا ہوا ہے نا؟'

'تم مجھے کیا سمجھتے ہو؟' اس نے چمک کر جواب دیا۔ 'رنڈی؟ بازار میں بیٹھنے والی؟ اور خود کو بڑا با اخلاق سمجھتے ہو؟ اسی لئے میرے گھر آنے سے ڈرتے ہو؟ لیکن تمہیں معلوم ہے کہ میں کتنے دن سے تمہارے بھائی سے نہیں ملی ہوں؟'

اودھ نمبر کتابی شکل میں

'نیا دور' نے گزشتہ برسوں میں کئی اہم اور دستاویزی نمبر شائع کئے ہیں۔ انہیں میں سے ایک 'اودھ نمبر' بھی ہے جسے دو حصوں شائع کیا گیا تھا۔ اب اسے ایک کتابی شکل میں شائع کیا گیا ہے۔ اردو ادب و تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے جو قارئین کرام اسے خریدنا چاہتے ہیں، وہ نیا دور سے براہ راست یا بذریعہ ای میل رابطہ قائم کر سکتے ہیں۔ اس کی قیمت ۲۰۰ روپئے ایڈوانس دینی ہوگی اور اسے منگوانے کیلئے ڈاک یا کوریر پر آنے والا خرچ ۵۰ روپئے ملا کر کل قیمت ۲۵۰ روپئے خریدار کے ذمہ واجب الادا ہوگی۔

ایڈیٹر ماہنامہ 'نیا دور'

میں نے اس کی طرف دیکھا۔ مجھے لگا کہ وہ جھوٹ نہیں بول سکتی۔

'کتنے دن سے؟'

'میں نے گنے نہیں،' اس نے زور دے کر کہا۔ 'لیکن جس رات تم پہلی بار یہاں آئے تھے، تب سے! میں نے اس سے کہہ دیا تھا کہ مجھ سے مت ملنا۔'

'اس نے کیا کہا؟'

'اس کو میری بات کا یقین نہیں آیا۔ کم سے کم مجھے تو یہی لگا۔ لیکن تب سے وہ مجھ سے ملنے نہیں آیا ہے۔'

دھیرے دھیرے مجھے اس میں تبدیلی محسوس ہونے لگی۔ اب وہ زیادہ تر وقت گھر ہی پر گزارنے لگی۔ اگر باہر نکلتی بھی تو پاس کے گاؤں میں اپنے رشتہ داروں کے پاس چلی جاتی اور کبھی کبھار بازار کا چکر لگا لیتی۔ رشتہ داروں سے مل کر شام کے وقت لوٹتے ہوئے اگر مجھے پچھواڑے میں بیٹھا دیکھتی تو وہاں چلی آتی۔ پھر کہتی، 'بہت دنوں سے گھر نہیں آئے، ایک بار آ جاؤ۔ آج رات آ جاؤ۔' پھر میں اس کے گھر چلا جاتا۔

ان موقعوں پر بات کرنے کے بجائے میرے بارے میں دریافت کرنے لگتی۔ پچھلے پندرہ برس گاؤں سے باہر گزاری ہوئی میری زندگی کی بابت جاننے کی کوشش کرتی۔ مجھے اپنے بارے میں بات کرنے کا کوئی شوق نہیں ہوتا تھا۔ میری نظر میں میرے پاس اپنے بارے میں اسے بتانے کے لائق کوئی خاص بات نہیں تھی۔ میں اس موضوع کو ٹال دیتا اور ہماری گفتگو وہیں رک جاتی۔ جب میں رات کو گھر آتا تو بھابی کچھ کہے بغیر دروازہ کھول دیتی اور کوئی سوال نہ کرتی۔ وہ اکثر سمتی کے بارے میں بات کرنے سے کترانے لگی۔

ک (بشکریہ 'آج')

(جاری)

انجانی محبت

اورہن پامک
۷ر جون ۱۹۵۲

یہ کہانی بوجا (گیہوں سے تیار شدہ ایک شربت) اور دہی فروخت کرنے والے 'میولتھ کاراتاس' کی زندگی اور دن میں خواب دیکھنے کی کہانی ہے۔ میولتھ کی پیدائش مغربی ایشیا کے سینٹرل اناتولیا کی دھند سے ڈھکی ایک جھیل کے ساحل پر آباد ایک گاؤں میں ۱۹۵۷ء میں ہوئی۔ بچپن گزارنے کے بعد ۱۲ر برس کی عمر میں وہ استنبول آ گیا اور اس کو اپنی دنیا تصور کرتے ہوئے وہیں کا ہوکر رہ گیا۔ جب وہ پچیس برس کا ہوا تو وہ اپنے گاؤں واپس گیا اور وہاں سے گاؤں کی ہی ایک لڑکی کو اپنے ساتھ بھگا لایا۔ اس عجیب وغریب حادثہ نے اس کی زندگی کی تصویر ہی بدل کر رکھ دی۔ اس لڑکی کو لے کر وہ سیدھا استنبول روانہ ہوگیا اور وہاں پہنچ کر اس نے نکاح کیا اور کچھ عرصہ بعد دو لڑکیوں کا باپ بن گیا۔ پیٹ پالنے کے لئے اس نے طرح طرح کے کاموں میں ہاتھ آزمائے۔ دہی، آئس کریم اور ابلے ہوئے چاول لے کر سڑکوں اور ہوٹلوں میں بھٹکتا پھرتا رہا اور اس دوران اس کی کوئی بھی شام رنگ برنگے ادھورے خوابوں کے بغیر نہ گزرتی۔

اس کہانی کا ہیرو میولتھ طویل قامت اور مضبوط جسم کا توانا نوجوان تھا۔ دیکھنے میں تو وہ کوئی بچہ سا لگتا، ہلکے بھورے بال اور تیز طرار نگاہیں۔ ان خصوصیات کے ساتھ اس کی جو شخصیت ابھر کر سامنے آتی، وہ عورتوں کے درمیان اسے کافی مقبول بناتی تھی۔ پچاس برس کی عمر تک پہنچتے پہنچتے بچوں جیسی معصومیت اور عورتوں میں اس کی شہرت کا باقی رہ جانا میولتھ کی کہانیوں کی متعدد الجھی ہوئی گتھیوں کو سلجھانے میں معاون ثابت ہوگی۔ جہاں تک میولتھ کی نیک نیتی کا سوال ہے، کئی لوگ اسے بچکانہ مزاج کا سمجھتے تھے۔ حالانکہ اس رخ سے اس کی زندگی کو دیکھنا اور سمجھانا کافی آسان ہوجاتا۔

کاش! میرے قاری بھی میری طرح کبھی میولتھ سے روبرو ہو پاتے تو وہ اس کے تئیں ان تمام عورتوں کی جاذبیت کو اچھی طرح سمجھ سکتے اور مجھ پر اس کی شخصیت کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنے کا الزام نہیں لگاتے۔ اس موقع پر میں صاف گوئی سے کام لوں گا کہ کہانی میں کہیں پر بھی کسی طرح کی مبالغہ آرائی سے کام نہیں لیا گیا ہے۔ یہ کہانی حقیقی حادثوں کی دین ہے۔ میں یہاں ان حادثات کو اس ترتیب سے بیان کروں گا کہ قارئین کو پوری کہانی بآسانی سمجھنے میں دشواری محسوس نہ ہو۔

میں اس کہانی کا آغاز جون ۱۹۸۲ء کے اس دن سے کروں گا جس دن میولتھ گسم دیرے گاؤں کی ایک لڑکی کو اپنے ساتھ بھگا لایا تھا۔ یہ اس کا پڑوسی گاؤں تھا جو کونیا ضلع میں آتا تھا۔ اس لڑکی کو اس نے پہلی مرتبہ چار سال پہلے اپنے چچازاد بھائی 'کورکٹ' کی شادی میں دیکھا تھا۔ یہی لڑکی بعد میں اس کے ساتھ گھر چھوڑ کر بھاگ جانے کو اتنی آسانی سے تیار ہوگئی تھی کہ وہ باور نہیں کر پا رہا تھا کہ محض ۱۳ر سال کی یہ لڑکی اس کی محبت کو سمجھ بھی پائے گی یا نہیں۔ وہ کورکٹ کی بیوی کی چھوٹی بہن تھی اور پہلی مرتبہ اپنے گاؤں کی چہار دیواری عبور کر کے استنبول آئی تھی۔ اس کے بعد ۳ر سالوں تک میولتھ مسلسل اسے محبت آمیز خطوط تحریر کرتا رہا۔ لڑکی نے کبھی جواب تو نہیں دیا مگر کورکٹ کا چھوٹا بھائی 'سلیمان' جو میولتھ کے محبت نامے اس لڑکی تک پہنچا دیتا اور اسے ہمیشہ اس کی محبت کی ہمیشگی کا دلاسہ دیتا رہتا۔ یہ سلیمان ہی تھا جس کی ترغیب پر میولتھ نے اپنے قدم اس پرخار راہ پر آگے بڑھائے تھے۔

آج سلیمان میولتھ کی مدد کے لئے پھر آگے آیا۔ اب لڑکی کو اس کے گاؤں سے بھگا کر استنبول لے جانے کی باری تھی۔ اس کے پاس اپنی فورڈ وین تھی۔ سلیمان میولتھ کو لے کر اپنے پشتینی گاؤں آیا جہاں دونوں نے مل کر لڑکی کو بھگانے کی ایسی اسکیم تیار کی جس

ترکی زبان کے ناول نگار اورہن پامک کو محض ۵۴ر سال کی عمر میں ۲۰۰۶ر میں ادب کے نوبل انعام سے نوازا گیا۔ اورہن پامک کی پیدائش اور پرورش تاریخی شہر استنبول میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم کے بعد فن تعمیر کی تین سال کی پڑھائی چھوڑ کر وہ کل وقتی مصنف ہو گئے۔ اس کے بعد انہوں نے صحافت میں گریجویشن کیا۔ انہوں نے ۱۹۷۴ء سے باقاعدہ لکھنا شروع کیا۔ انہیں نوبل انعام کے علاوہ بھی درجنوں اہم اعزازات سے نوازا جا چکا ہے۔ وہ اپنے آپ کو کلچرل مسلم گردانتے ہیں۔ ان کی تحریروں میں گزشتہ صدی کے استنبول کی تہذیب وثقافت کے علاوہ ترکی معاشرے کے صفات جابجا نظر آتے ہیں۔ اب تک انگریزی اور ترکی میں ان کی درجنوں تصنیفات منظر عام پر آچکی ہیں جن کا دنیا کی مختلف زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔

'انجانی محبت' اورہن پامک کی مشہور کہانی ہے جس کا ترجمہ **محمد سرور رضوی** نے کیا ہے۔

سے لوگوں کو کانو کان خبر نہ ہو۔ اس اسکیم کے مطابق سلیمان کو گاؤں سے ایک گھنٹے کی مسافت پر گاڑی لے کر ان دونوں کا انتظار کرے گا کیونکہ اس وقوعہ کی بھنک لگتے ہی تمام افراد قریب کے شہر بیسیہل کی طرف بھاگتے لیکن حقیقت میں سلیمان کی فورڈ وین ان دونوں کو لے کر شمال کی سمت کے پہاڑوں کو عبور کر اکسیہر ریلوے اسٹیشن پر چھوڑ دیتا۔ میولتھ دل ہی دل میں اس کام کی ریہرسل کر چکا تھا اور دو مرتبہ ان راستوں کا معائنہ بھی کر آیا تھا جہاں سے اسے بھاگنا تھا۔ مقررہ وقت سے آدھا گھنٹہ پہلے ہی وہ گاؤں پہنچ گیا اور قبرگاہ سے لگ کر آنکھیں بند کر کے دم سادھے کھڑا ہو گیا۔ دل ہی دل میں اس نے خدا سے دعا مانگی کہ سب کچھ اسی طرح سے انجام پائے جیسے انہوں نے پلان بنایا ہے۔ اس کام میں سلیمان کی مدد تو اس نے قبول کر لی تھی مگر نہ جانے کیوں وہ اس پر اعتماد نہیں کر پا رہا تھا۔ کئی بار اسے محسوس ہوا کہ جو جگہ طے ہے وہاں پہنچنے پر اسے سلیمان گاڑی کی نہیں ملی تو۔۔۔۔! میولتھ بار ہا ان خیالات کو دماغ پر حاوی ہونے سے روکنے کی کوشش کر رہا تھا اور اپنے دل کو سمجھا رہا تھا کہ بہت زیادہ سوچنا صحیح نہیں ہے۔ دل میں بیٹھا ہوا خوف کسی کا بھلا نہیں کرتے لہٰذا جو ہوگا دیکھا جائے گا۔

جب وہ مڈل اسکول میں زیر تعلیم تھا اور ساتھ ہی اپنے والد کے ہمراہ سڑکوں پر گھوم گھوم کر دہی بھی فروخت کرتا تھا، تب اس نے شہر سے ایک نیلے رنگ کی قمیض اور پینٹ خریدی تھی، آج وہ وہی پہنے ہوئے تھا۔ فوج میں خدمات انجام دیتے وقت فوج کی کینٹین سے جو جوتے خریدے تھے وہ آج اس کے پیر میں تھے۔ اندھیرا چھانے کے بعد وہ لڑکی کے والد کریہہ الصورت 'عبدالرحمن' کی کوٹھی کے عقب کی شکستہ دیوار پھاند کر اندر احاطہ میں آ گیا۔ پیچھے کی کھڑکی میں اندھیرا تھا۔ میولتھ طے شدہ وقت سے دس منٹ پہلے ہی پہنچ گیا اور جلد سے جلد وہاں سے نکل جانا چاہتا تھا۔ اس کے ذہن میں ماضی کے واقعات گھومنے لگے کہ جب ایسے ہی کسی لڑکی کو بھگانے کی بات ہوتی تھی تو خونی لڑائیاں اور گولی باری کا ذکر ضروری تھا، بسا اوقات رات کے اندھیرے میں راستہ بھٹک جاتے اور پکڑے جاتے تھے۔ گھبراہٹ میں وہاں پر کھڑے کھڑے یہ بھی خیال آیا کہ خوف کی وجہ سے جب لڑکیاں بھاگنے کا خیال ترک کر دیتی ہوں گی تو لڑکوں کو کتنی شرمندگی اور ضلالت جھیلنے پڑتی ہوگی۔ ان سب باتوں کے ذہن میں آتے ہی اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے لیکن اس نے خدا کو یاد کیا کہ وہی اس کی حفاظت کرے گا۔

> کتوں کا جھنڈ لگاتار بھونکے جا رہا تھا۔ میولتھ کو احساس تھا کہ اس گاؤں کے لئے وہ اجنبی ہے اور کتوں میں کوئی بھی اس کی بو سے متعارف نہیں۔ یکا یک اسے دور شہر کی جانب سے بندوق کی گولی کی آواز سنائی دی۔ وہ دونوں سہم کر ٹھہر گئے۔ کچھ منٹ بعد پھر رفتار پکڑی۔ کتے، جو تھوڑے وقفے کے لئے خاموش ہو گئے تھے، پھر سے بھونکنے لگے۔ وہ دونوں پہاڑی سے نیچے اترنے لگے۔ تیز رفتاری کے سبب پہاڑ کے پیڑوں کی شاخوں سے ان کے چہروں پر خراشوں کے نشان پڑ گئے تھے اور کپڑے بھی پھٹ گئے تھے۔ کئی بار میولتھ کو احساس ہوا کہ وہ اندھیرے میں وہ کسی نوکیلی چٹان پر نہ گر پڑے لیکن وہ اس سے محفوظ رہا البتہ کتوں سے اسے سخت خوف محسوس ہو رہا تھا ساتھ ہی اسے خدا پر مکمل اعتماد تھا۔

رات تاریک تھی۔ کتے بھونک رہے تھے، پل بھر کو کھڑکی میں روشنی ہوئی لیکن چند لمحہ بعد پھر ویسا ہی اندھیرا۔ میولتھ کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ اس نے گھر کی جانب قدم بڑھائے۔ پیڑوں کے جھرمٹ سے اسے سرگوشی سنائی دی۔

'میولتھ!' اس آواز میں محبت کی آمیزش تھی۔ یہ اسی کی آواز ہو سکتی ہے جس نے ملیٹری سروس کے دوران اس کے بھیجے ہوئے سیکڑوں محبت نامے پڑھے ہوں۔ اس آواز سے اعتماد ظاہر ہو رہا تھا۔ میولتھ کو اپنی تحریر کردہ سیکڑوں خطوط ایک ایک کر کے یاد آنے لگے جو محبت اور خواہشوں کی چاشنی سے پُر تھے۔ اس کے ذہن میں شدت سے یہ بات بھی کوند گئی کہ کیسے اس نے اپنی زندگی کا ایک ہدف اس خوبصورت لڑکی کے دل کو جیتنا بنا رکھا تھا اور اسے حاصل کرنے کی خوشی رہ رہ کر اس کے دل میں ابھرتی کہ آج وہ اس لڑکی کے پاس پہنچ ہی گیا۔

اس نے آس پاس کچھ نہیں دیکھا اور اس کی میٹھی آواز کی طرف قدم بڑھاتا چلا گیا بالکل اسی طرح جیسے کوئی نیند میں چلتا ہے۔ دراصل اس کے لئے یہ رات ایک معمولی رات نہیں تھی۔ یہ رات ایک جادوئی رات تھی۔

رات کے اندھیرے میں وہ دونوں ایک دوسرے سے ملے اور بغیر کچھ بولے، بنا کچھ سوچے ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے بھاگنے لگے۔ ابھی مشکل سے دس قدم بھی نہیں بھاگے ہوں گے کہ کتوں نے دوبارہ بھونکنا شروع کر دیا اور گھبرا کر میولتھ راہ بھٹک گیا۔ اندھیرے میں کچھ دکھائی تو دے نہیں رہا تھا مگر میولتھ نے صبر کا دامن ہاتھ سے جانے نہ دیا اور جلد ہی صحیح راستے پر آ گیا۔ رات کی تاریکی میں پیڑوں کی قطار کئی بار کنکریٹ کی دیوار کا وہم پیدا کرتی اور اسے لگ رہا تھا جیسے وہ حقیقت میں نہیں خواب میں مسلسل دوڑ رہا ہو۔

کچی پگڈنڈیوں کو پار کر کے میولتھ پہاڑ پر چڑھنے لگا۔ یہ راستہ اس کی اسکیم میں شامل تھا۔ دوڑتے دوڑتے ایک جگہ پر چٹانوں کے درمیان اتنی تنگ اور کھڑی چڑھائی تھی کہ اسے لگا کالے بادلوں سے ڈھکا آسمان سر سے ٹکرا جائے گا۔ مضبوطی سے ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے، ایک بار بھی دم لئے بنا وہ دونوں آدھے گھنٹے میں پہاڑی کی چوٹی پر پہنچ گئے۔ وہاں سے ایک جانب شہر کی روشنی اور دوسری جانب اس کا اپنا گاؤں

صاف دکھائی دے رہا تھا جہاں وہ پیدا ہوا اور اس نے بچپن گزارا تھا۔ میولتھ نے عمداً پیچھا کرنے والوں سے بچنے کی نیت سے شہر کے باہر کا راستہ اختیار کیا۔ اس انتخاب کا ایک مقصد سلیمان کے دھوکے کا اندیشہ بھی شامل تھا۔

کتوں کا جھنڈ لگاتار بھونکے جا رہا تھا۔ میولتھ کو احساس تھا کہ اس گاؤں کے لئے وہ اجنبی ہے اور کتوں میں کوئی بھی اس کی بو سے متعارف نہیں۔ یکا یک اسے دور شہر کی جانب سے بندوق کی گولی کی آواز سنائی دی۔ وہ دونوں سہم کر ٹھہر گئے۔ کچھ منٹ بعد پھر رفتار پکڑی۔ کتے، جو تھوڑے وقفے کے لئے خاموش ہو گئے تھے، پھر سے بھونکنے لگے۔ وہ دونوں پہاڑی سے نیچے اترنے لگے۔ تیز رفتاری کے سبب پہاڑ کے پیڑوں کی شاخوں سے ان کے چہروں پر خراشوں کے نشان پڑ گئے تھے اور کپڑے بھی پھٹ گئے تھے۔ کئی بار میولتھ کو احساس ہوا کہ وہ اندھیرے میں وہ کسی نوکیلی چٹان پر نہ گر پڑے لیکن وہ اس سے محفوظ رہا البتہ کتوں سے اسے سخت خوف محسوس ہو رہا تھا ساتھ ہی اسے خدا پر مکمل اعتماد تھا کہ وہ اس کا اور رائحہ کا بال بھی بانکا نہیں ہونے دے گا اور وہ دونوں استنبول پہنچ کر ہنسی خوشی اپنی زندگی گزار سکیں گے۔

جب وہ اکسیہر جانے والی سڑک پر پہنچے تو دوڑتے دوڑتے ان کی سانس اکھڑنے لگی تھی۔ میولتھ کو پختہ یقین تھا کہ وہ طے شدہ وقت سے پہلے ہی یہاں پہنچ گیا ہے۔ اب بس اسے سلیمان کی گاڑی کا انتظار تھا۔ اس کے بعد تو کسی کی مجال نہیں کہ کوئی اسے اور رائحہ میں جدائی پیدا کر دے۔

اپنے ہر خط کی ابتدا میولتھ اپنی محبوبہ کے خوبصورت چہرے اور تصوراتی آنکھوں کی تصویر اور ان پر نہایت خوبصورت طریقہ سے تحریر کردہ نام رائحہ کے ساتھ کرتا۔ وہ اپنی محبوبہ کے ہمراہ کھڑے ہو کر ماضی کی یادوں میں کھو گیا جس نے اس کی خوشی کو دوبالا کر دیا تھا۔

رات اتنی تاریک تھی کہ وہ جسے بھگا کر لے جا رہا تھا، اس لڑکی کی شکل تک ٹھیک سے دیکھنے کا موقع نہ ملا۔ اس کے دل میں کہیں کہیں پر یہ بات آئی کہ وہ کچھ لمحہ ٹھہر کر اپنی محبوبہ کو کم سے کم گلے سے لگا لے، چوم تو لے، لیکن اس کی ہر کوشش کو رائحہ اپنے ساتھ لائی ہوئی گٹھری کو حائل کر کے ناکام کرتی رہی۔ میولتھ نے اسے نظر انداز کر دیا۔ محبوبہ کا یہ سلوک اسے بھلا ہی لگا۔ آخر کار اس نے طے کر لیا کہ جس کے ساتھ رشتۂ ازدواج میں بندھ کر زندگی گزارنا ہے اس سے ابھی سے کیسا لمس؟ راستے میں ندی تھی۔ وہ دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے ندی کے چھوٹے سے پل کو پار کر گئے۔ اس کے ہاتھ میں رائحہ کا ہاتھ تھا، پرندے جیسا نرم و نازک۔ موسم خوشگوار تھا۔ ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکوں کے ساتھ پانی کے بہاؤ کی آوازیں اور پھول پتیوں کی خوشبو ان کے مشام کو معطر کر رہی تھی۔

اسی اثنا میں پہلے تو بجلی چمکی پھر زوردار کڑک سنائی دی۔ میولتھ کو فکر لاحق ہوئی کہ ریلوے اسٹیشن پہنچنے سے پہلے ہی بارش انہیں بھگو نہ دے۔ اس نے اپنی رفتار نہیں بدلی۔ دس منٹ بعد انہیں سلیمان کی گاڑی کی عقبی لائٹیں دکھائی دیں۔ میولتھ کی خوشی کا ٹھکانہ نہیں رہا لیکن اس کا چہرہ سلیمان کی نیت پر شک کرنے پر افسوس بھی ظاہر کر رہا تھا۔ بارش کی بوندوں نے رفتار پکڑ لی مگر دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے بارش کا مزہ لیتے ہوئے آگے بڑھتے رہے۔ چلتے چلتے انہیں احساس ہوا کہ روشنی جتنی نزدیک محسوس ہو رہی تھی، حقیقتاً ایسا نہیں تھا۔ بہر حال گاڑی تک پہنچتے پہنچتے وہ بری طرح بھیگنے کے ساتھ ساتھ تھک کے چور ہو گئے تھے۔

رائحہ اپنے سامان کی گٹھری لئے گاڑی کی عقبی نشست پر بیٹھ گئی۔ وہاں اتنا اندھیرا تھا کہ اس کی صورت نہیں دکھائی پڑ رہی تھی۔ میولتھ اور سلیمان دونوں چاہتے بھی یہی تھے کہ رائحہ کے گھر سے بھاگ جانے کی خبر اگر پھیلے بھی اور گاڑیوں کی تلاشی ہونے لگے تو پیچھے بیٹھی رائحہ کسی کو نظر نہ آ سکے۔ دوسری بات یہ تھی کہ سلیمان نہیں چاہتا تھا کہ سلیمان رائحہ کو پہچان سکے۔ گاڑی میں سلیمان اور میولتھ سامنے کی سیٹ پر بیٹھ گئے تو میولتھ نے سلیمان سے کہا:

'سلیمان! میں تا دم آخر تمہارا شکر گزار رہوں گا اور اس دوستی اور بھروسہ کا احسان میری گردن پر ہمیشہ رہے گا' یہ کہتے ہوئے میولتھ نے کس کے سلیمان کو گلے لگا لیا لیکن جب سلیمان نے ویسی گرم جوشی کا مظاہرہ نہیں کیا تو سلیمان کو شرمندگی کا احساس ہوا۔ اسے لگا کہ شاید سلیمان کو اس کے شک کرنے کی بات پتہ چل گئی اور وہ اندر سے ٹوٹ گیا ہے۔

'تم قسم کھاؤ کہ یہ بات دنیا میں کسی کو نہیں کہو گے کہ رائحہ کو بھگانے میں میں نے تمہاری کوئی مدد کی۔ کسی سے بھی نہیں!' سلیمان نے پُراعتماد لہجہ میں کہا۔

میولتھ نے قسم کھاتے ہوئے راز کو راز رکھنے کی حامی بھری۔

'دیکھو! اس نے عقبی دراوازہ ٹھیک سے بند نہیں کیا ہے۔' سلیمان نے کہا۔

میولتھ باہر نکلا اور گاڑی کے پیچھے جا کر دروازے کو پھر سے کھول کر بند کرنے لگا۔ تبھی آسمان میں بجلی چمکی اور پل بھر کے لئے آسمان، پہاڑیاں، چٹانیں اور پیڑ ایک ساتھ دکھائی دئے جیسے ماضی کی کوئی خیال تصویر ایک دم سے دماغ کے کینوس پر آ جائے۔ اس بجلی کی بدولت اس سفر میں پہلی مرتبہ میولتھ کی نظر اس لڑکی پر پڑی جو اس کی شریک حیات ہونے والی تھی۔ وہ لمحہ مستقبل میں اسے ہمیشہ یاد رہنے والا تھا۔

گاڑی دوبارہ چل پڑی۔ سلیمان نے تولیہ نکالا اور میولتھ کو دیتے ہوئے بولا، 'اس سے اپنا بدن سکھا لو'

میولتھ نے تولیہ ہاتھ سے پکڑا اور ناک کے پاس لے جاتے ہوئے اسے سونگھا، برساتی بو نہ آنے پر اسے اطمینان ہو گیا اور اس نے وہ تولیہ گاڑی میں بیٹھی لڑکی کی

جانب بڑھا دیا۔ کچھ دور چلنے پر سلیمان بولا:

'تم تو ابھی بھی گیلے ہو لیکن میرے پاس کوئی دوسرا تولیہ نہیں ہے۔'

بارش کافی تیز تھی۔ گاڑی کی چھت پر پڑنے والی بوندوں کی آوازوں نے اندر بیٹھنے والوں کو تیز آواز میں باتیں کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ وائپر شیشے پر تیزی سے پھسل رہا تھا۔ وہ سب ان سب ہلچلوں سے پرے لامتناہی سکوت اختیار کئے ہوئے منزل کی جانب رواں دواں تھے۔ جنگل میں تاریکی کی حکومت تھی۔ گاڑی کی ہلکی پیلی روشنی اندھیرے کی اس حکومت میں دور تک پہنچ بنا رہی تھی۔ میولتھ نے سن رکھا تھا کہ رات میں جنگل کے بھیڑیئے، سیار اور بھالو بھٹکنے والی بدروحوں سے ملاقات کرتے ہیں۔ استنبول کی سڑکوں پر اس کا ایسے کئی کرداروں کے ساتھ آمنا سامنا بھی ہوا ہے۔ اندھیرے سے استفادہ کر کے عجیب وغریب شکل و صورت والی بدروحیں، گناہگار اور ناامید انسانوں اور اپنی راہ بھٹکے ہوئے راہگیروں کو دبوچ لیتی ہیں اور اپنی جائے سکونت پر قید کر دیتی ہیں۔

'کیا ہماری زبان بلی اٹھالے گئی؟' سلیمان نے مذاق میں کہا۔

میولتھ کو اس وقت احساس ہوا کہ اس پر جو عجیب سی خاموشی طاری ہوگئی ہے وہ مستقبل میں سالہا سال اس کا پیچھا نہیں چھوڑے گی۔ وہ دل ہی دل میں سوچنے لگا کہ حالات کس طرح اسے گھیرتے ہوئے یہاں تک لے آئے ہیں۔ اندھیرے میں کتے ابھی بھی بھونک رہے تھے لیکن حال ہی کے واقعہ کی کامیابی اسے سکون کا احساس کرا رہی تھی۔

'کچھ بات ہے کیا؟' سلیمان نے اسے خاموش دیکھ کر پوچھا۔

'کچھ بھی نہیں۔' یک بیک اس کے منھ سے نکلا۔

تپلی اور کیچڑ بھری سڑکوں پر جب گاڑی مڑتی تو سامنے کی چٹانیں روشنی میں چمک اٹھتیں پر پیڑوں کے جھرمٹ اور ان کے درمیان الجھی ہوئی پرچھائیاں عجیب سا ڈراؤنا ماحول بنا رہی تھیں۔ جیسے ہی میولتھ کی نظر ان پر پڑتی، اسے خیال آتا کہ یہ مناظر تاحیات رہ رہ کر یاد آتے رہیں گے۔ اس کی گاڑی کبھی سانپ کی طرح پہاڑیوں کے چکر لگاتی، کبھی نیچے آتی تو کبھی اوپر چڑھ جاتی۔ وہاں سے گاؤں کیچڑ بھرے کسی تالاب کی طرح نظر آرہے تھے۔ راستے میں جہاں کہیں بھی بستی پڑتی، بھونکتے ہوئے کتے ضرور دکھائی دیتے اور بستی کے گزرتے ہی پھر ہُو کا عالم اور ایک سکوت انگیز سناٹا۔ میولتھ اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ یہ اجنبی پن اس کے دل کے اندر ہے یا باہری دنیا میں۔ گھنے اندھیرے میں کبھی غیر معروف پرندے دکھائی دیتے تو کبھی غیر مانوس تحریریں۔ سیکڑوں برس پہلے خون آشام جنگوں میں مر کٹ چکی بدروحوں کا تصور بھی اس کی نظروں کے سامنے گھوم جاتا۔ اسے کئی ایسے لوگوں کی پرچھائیاں بھی نظر کے سامنے سے گزریں جو اپنے گناہوں کی وجہ سے چٹان بن کر زمین میں دھنس گئے تھے۔

'کوئی افسوس تو نہیں؟' سلیمان نے اس سے پوچھا۔ پھر خود ہی بولا:

'ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔' مجھے نہیں لگتا کہ کوئی ہمارا تعاقب کر رہا ہے۔ ان سب لوگوں کو معلوم ہوگا کہ لڑکی گھر پر ٹھہرنے والی نہیں ہے، ایک نہ ایک دن بھاگ ہی جائے گی۔ ہاں، اس کا فریبی باپ بھلے ہی غفلت میں رہا ہو پر اس کے ساتھ نپٹنا مشکل نہیں۔ تم دیکھتے رہنا، مہینہ دو مہینہ گزرتے ہوئے تلاش کرتے کرتے تم تک پہنچ ہی جائے گا پھر گرمیاں ختم ہوتے ہوتے تم دونوں اپنے گاؤں پہنچ کر بزرگوں کی دعائیں لوگے اور یاد رکھنا! کسی سے یہ نہیں بتانا ہے کہ اس معاملہ میں میں نے تمہاری کسی بھی طرح کی مدد کی تھی۔'

ایک تنگ موڑ پر اوپر چڑھتے ہوئے اس کی گاڑی کا پہیہ کیچڑ میں پھنس گیا۔ پل بھر کو میولتھ کو لگا کہ جیسے سب کچھ ختم ہو گیا اور رائحہ اب اپنے گاؤں واپس چلی جائے گی۔ وہ بھی استنبول چلا جائے گا بغیر کسی جھنجھٹ کے۔ تبھی کیچڑ میں پھنسی ہوئی گاڑی آگے کی جانب چل پڑی۔

قریب ایک گھنٹہ کے بعد اکا دکا مکانات نظر آنے لگے تو محسوس ہوا کہ شہر آ گیا ہے۔ ریلوے اسٹیشن شہر کی دوسری سمت پر تھا۔

'چاہے کچھ بھی ہو جائے، تم دونوں الگ نہیں ہونا' سلیمان نے انہیں اسٹیشن پر اتارتے ہوئے کہا۔

اس نے گاڑی کے اندر گٹھری بنی لڑکی پر سرسری نگاہ ڈالی۔

'میں گاڑی سے باہر نہیں نکلوں گا، میں چاہتا نہیں کہ وہ مجھے پہچان جائے۔ اب تو اس پورے معاملہ میں میرا شامل ہونا ثابت ہو ہی گیا ہے۔ رائحہ کو تم ہمیشہ خوش رکھنا، میولتھ! سمجھے نا! اب وہ تمہاری بیوی ہے، اس کی قسمت تمہاری قسمت کے ساتھ وابستہ ہو گئی ہے۔ جب استنبول پہنچنا تب بھی اس کے اوپر رعب مت جمانا، اس کا دل رکھنا۔'

میولتھ اور رائحہ سلیمان کو جاتے ہوئے تب تک دیکھتے رہے جب تک گاڑی اندھیرے میں گم نہ ہو گئی۔ دونوں آہستہ آہستہ قدم بڑھاتے ہوئے ریلوے اسٹیشن میں داخل ہو گئے۔ بغیر ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے۔ میولتھ نے پہلی بار اس لڑکی کا چہرہ روشنی میں دیکھا جسے وہ گھر سے بھگا لایا تھا۔ وہ اپنے دل کی تسلی کرنا چاہتا تھا کہ یہ وہی لڑکی ہے جسے اس نے گاڑی کے عقبی حصہ میں بیٹھا کر دروازہ بند کیا تھا۔

پر یہ تو وہ لڑکی نہیں ہے جسے اس نے استنبول میں چچازاد بھائی 'کورکٹ' کی شادی میں دیکھا تھا۔ حقیقتاً یہ اس لڑکی کی بڑی بہن تھی۔ شادی میں انہوں نے اسے خوبصورت لڑکی دکھائی تھی پر وداعی کے وقت اس کی بدصورت بہن کو اس کے ساتھ کر دیا۔ میولتھ کو لگا، اس کے ساتھ فریب ہوا ہے۔ اس کو خود پر شرم آئی۔ اس کو لگنے لگا کہ یہ لڑکی دوسری ہے۔ تو اس کا نام بھی

رائحہ نہیں کچھ اور ہو۔ کس نے؟ اور کیسے کیا یہ سب؟ اسٹیشن پر چلتے چلتے اس کے قدموں کی آہٹ بھی اسے اجنبی محسوس ہو رہی تھی۔ اسے لگا، جب تک وہ زندہ رہے گا ان پلوں کا فریب اس کا پیچھا کرتا رہے گا۔

اسی کشمکش میں اس نے استنبول کے دو ٹکٹ خریدے۔ ٹکٹ کاؤنٹر پر بیٹھے ہوئے کلرک نے بتایا کہ گاڑی جلدی آنے والی ہے پر دور دور تک گاڑی کا کوئی نام و نشان نہیں دکھائی دے رہا تھا۔ وہ دونوں ایک چھوٹے سے ویٹنگ روم میں کونے کی بنچ پر بیٹھ گئے۔ نزدیک ہی سامانوں کا ڈھیر اور مسافروں کی بھیڑ بے ترتیب ڈھنگ سے پڑے ہوئے تھے۔ آپس میں انہوں نے کوئی بات نہیں کی۔

بیٹھے بیٹھے میولتھ کو یاد آیا کہ رائحہ کی ایک بڑی بہن یا یوں کہیں کہ اسے لگا کہ وہ سندر لڑکی ہی رائحہ ہے۔ کیونکہ اصل رائحہ تو اس کے ساتھ بیٹھی ہوئی لڑکی ثابت ہوئی۔ گاڑی میں تھوڑی بہت گفتگو کے دوران سلیمان نے اس کو رائحہ کے نام ہی سے مخاطب کیا تھا۔ میولتھ نے رائحہ کو مخاطب کر کے جتنے محبت نامے ارسال کئے اس کے پس منظر میں یہ لڑکی نہیں بلکہ دوسری لڑکی تھی جس کا چہرہ اس لڑکی سے ایک دم الگ تھا۔ سالوں سال سے خوبصورت چہرے والی جس لڑکی صورت اس کے ذہن نشین تھی میولتھ کو اس کا نام تک نہیں معلوم تھا۔ دماغ پر بہت زور ڈالنے پر بھی اسے یاد نہیں آیا کہ کن کن راہوں سے گزر کر وہ یہاں تک آ گیا تھا۔ یہاں تک مطلب ایک طرح کا پھندا جس میں کسی کی سازش کے تحت وہ قید ہو گیا تھا۔ پیچ و خم بھرے راستے کی گتھی سلجھانے کی ادھیڑ بن میں اس کا ذہن بھٹک رہا تھا۔

جب وہ بنچ پر بیٹھے تھے تب میولتھ نے رائحہ کا صرف ہاتھ دیکھا تھا۔ کچھ دیر پہلے اس نے بہت پیار کے ساتھ اس کا ہاتھ تھاما تھا۔ اس ہاتھ کو تھامنے والا اس کا خود کا ہاتھ کتنا نادان تھا کہ خوبصورت ہاتھوں کی مالکن کو خطاب کرتے ہوئے متعدد محبت نامے لکھے تھے۔ اس کا ہاتھ لڑکی کی گود میں تھا اور کچھ وقفہ کے بعد کپڑوں کی سلوٹیں درست کرنے کے لئے حرکت کرتا تھا۔

میولتھ وہاں سے اٹھا اور سامنے کی دکان سے رائحہ کے لئے دو سوکھے ہوئے بن لے کر آیا۔ دور ہی سے اس نے لڑکی کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ اسے یقین ہو گیا کہ کورکٹ کی شادی میں وہ جس خوبصورت لڑکی پر مرمٹا تھا، یہ وہ لڑکی نہیں ہے۔

ایک اور بات، میولتھ نے اس لڑکی کو پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ یہ لڑکی جو حقیقتاً رائحہ ہے۔ وہ اس گتھی کو سلجھا نہیں پا رہا تھا کہ وہ دونوں یہاں تک کیسے آ پہنچے۔ کیا رائحہ کو معلوم ہے کہ اس نے جو محبت آمیز خط لکھے تھے وہ اس کے لئے نہیں بلکہ اس کی بڑی بہن کے لئے تھیں۔

'کیا تم بن کھاؤ گی؟'

رائحہ نے ہاتھ بڑھا کر بن لے لیا۔ میولتھ نے غور سے دیکھا، اس کی آنکھوں میں احسان کا جذبہ نظر آ رہا تھا نہ کی ایک گھر سے بھاگی ہوئی محبوبہ کا جوش۔ میولتھ اس کے برابر میں بیٹھا تھا۔ رائحہ نے جس ڈھنگ نے بن کھایا، اسے دیکھ کر ایسا لگتا تھا کہ جیسے کوئی گناہ کر رہی ہو۔ میولتھ نے دوسرا بن بغیر مزے کے کھا لیا۔ محض اس لئے کہ اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس دوسرے بن کا کیا کرے۔

بغیر کچھ بات کئے دونوں ساتھ ساتھ بیٹھے رہے۔ میولتھ کو محسوس ہو رہا تھا کہ اسکول کا آخری گھنٹہ ختم ہو گیا ہے اور اب اس کے پاس کرنے کو کچھ نہیں ہے۔ گہرے تفکر کے بعد بھی اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس سے یہ غلطی کیسے سرزد ہو گئی۔ گاڑی کے آنے کی ابھی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی۔ میولتھ بنچ سے اٹھا اور بن والی دکان پر گیا لیکن اب وہ دکان بند ہو چکی تھی۔ صرف دو تانگے نظر آ رہے تھے جنہیں مسافروں کا انتظار تھا۔ ایک تانگے والا خاموشی سے سگریٹ کے کش لے رہا تھا۔ چند لمحہ وہاں کھڑا رہنے کے بعد وہ بنچ کی طرف واپس لوٹا تو رائحہ کے چہرے پر ایک بار پھر نظر پڑی۔

نہیں، بالکل نہیں! یہ وہ لڑکی نہیں ہے جسے اس نے چار سال پہلے شادی میں دیکھا تھا۔

❑❑❑

'نیا دور' کو ایسی ادبی تخلیقات کا شدت سے انتظار ہے جو نہ صرف دلچسپ بلکہ معلوماتی بھی ہوں۔ ایسی تخلیقات جو اعلیٰ درجے کے ادبی شہ پاروں کی حیثیت رکھتی ہیں مگر عام قاری کی دلچسپی سے عاری ہوں تو اسے 'نیا دور' اپنی اشاعتی ترجیحات میں شامل کرنے سے گریز کرے گا کیونکہ معاملہ در اصل اردو کے فروغ کا ہے۔ اردو محض یونیورسٹیوں کے شعبوں، تحقیقی اداروں اور دیگر اردو مراکز تک اپنی مخصوص ضرورتوں کے تحت محدود رہے، اس روش سے بہر حال پرہیز کرنا وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔ ہم سب کا اولین فریضہ ہے کہ اردو زبان کے فروغ میں پوری تندہی کے ساتھ شامل رہیں اور عام قاری سے اردو کے مراسم کو استوار کرنے کا کوئی بھی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیں۔ تخلیق کا غیر مطبوعہ ہونا لازمی ہے۔ تخلیق کے ساتھ اپنی تصویر، ٹکٹ لگا ہوا لفافہ معہ پتہ اور بینک اکاؤنٹ نمبر، آئی۔ایف۔ایس سی، برانچ کوڈ والا Crossed Cheque بھی ضرور ارسال کریں۔

شعری مجموعہ 'احساس' صغیر نوری کے افکار تازہ کا ایک دلکش ذخیرہ ہے۔ مجھے اس کا نام 'احساس' پڑھ کر خوشی بھی ہوئی اور ہنسی بھی آئی۔ خوشی اس لئے ہوئی کیونکہ مجھے یہ نام اتنا پسند تھا کہ میں نے اپنے مجموعہ کا نام ہی 'احساس' رکھا تھا جو اتر پردیش اردو اکادمی کے مالی تعاون سے ۲۰۱۵ء میں شائع ہوا تھا اور ۱۰ر جنوری ۲۰۱۶ء کو شبینہ کلب ردولی کے زیر اہتمام اس کی رسم اجراء ہوئی تھی۔ ہنسی، اردو اکادمی کی اس بے حسی اور لاپروائی پر آئی کہ امر پر دھیان نہ دیا کہ اس نام کا مجموعہ وہ صرف ایک سال پہلے ہی چھپوا چکی ہے۔

کچھ بھی بچا نہ پاس تو احساس یہ ہوا
اپنی تباہیوں کا سبب بے حسی رہی

بے حسی کی جب یہی چھوٹی چھوٹی باتیں جب سمندر بن جاتی ہیں تو ان میں سنامی کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے جو ایک دن بڑی تباہیوں کا سبب بن جاتی ہے اور ہمارے یہاں تو بے حسی کی یہ موج مستی صدیوں سے چل رہی ہے۔ اسی کا نتیجہ یہ قومی زوال ہے۔ مذکورہ بالا شعر صغیر نوری ہی کا ہے جو بروقت یاد آ گیا۔ ایسے ہی اشعار کسی کو عظیم شاعر بنا دیتے ہیں۔

جہاں تک میں جانتا ہوں، اچھی اور عظیم شاعری کے لئے ضروری ہے کہ وہ خیالات و احساسات کی دنیا کی فطری تصویر کشی کرے اور حقیقی زندگی کے تلخ و شیریں لمحات کی آئینہ دار ہو لیکن یہ دیکھنا بھی ضروری ہے کہ اس میں استقبالیت کتنی ہے۔ وہ کتنے زمانے تک زندہ رہے گی؟ میرؔ و غالبؔ اسی وجہ سے آج بھی زندہ ہیں اور نہ جانے کب تک زندہ رہیں گے اور اب تو دنیا Global Village بن چکی ہے تو یہ بھی دیکھنا ضروری ہے کہ شعر مختلف النوع تہذیب و کلچر میں قابل فہم بھی ہوگا یا نہیں؟ اس میں کس قدر آفاقیت پائی جاتی ہے۔

صغیر نوری کے شعری مجموعہ 'احساس' میں ایک معتد بہ تعداد ایسے اشعار کی ہے جو زندگی کے تلخ و شیریں لمحات کے سچے اور حقیقی ترجمان ہیں اور ہماری زندگی کے آئینہ دار بھی ہیں اور سامعین و قارئین ان سے متاثر ہوں گے۔ اگر کسی شخص کا ذاتی تجربہ عالم انسانیت کے مسرت و الم کا آئینہ دار ہو جائے تو کیا کہنا مگر اس بات سے ہوشیار رہنا چاہئے کہ ہم پر دوسروں کی نقالی کا الزام نہ آ جائے۔ دوسروں کے چبائے ہوئے نوالوں کا اعادہ تعفن پیدا کرتا ہے چاہے ہم کتنا ہی الفاظ بدل کر نظم کریں۔ اس طرح کی غلطی سے بچنے کے لئے وسیع المطالعہ ہونا بھی ضروری ہے۔

دوسروں کی نئی تراکیب جیسے 'فصیل شہر' اور 'حصار انا' وغیرہ کا استعمال کر کے اپنے نئے مضمون کو برباد نہ کرنا چاہئے کیونکہ سامعین و قارئین ایسے شاعر کو نقال سمجھنے لگتے ہیں۔

صغیر نوری صاحب بصیرت ہیں اور کیوں نہ ہوں، وہ ایک ایسے خاندان کے چشم و چراغ ہیں جو صاحب بصیرت تھے۔

صغیر نوری کے اسی مجموعہ میں طویل بحروں اور لمبی ردیفوں والی بہت سی غزلیں ہیں جس سے ان کی مہارت فن کا پتہ چلتا ہے۔

کیوں بھوکے سو جاتے ہیں اس دور ترقی میں بھی لوگ
غم کی نئی اک شام سجا کر میں بھی سوچوں تو بھی سوچ

مبصر : تقی شبر نما
قیمت : 200 روپئے
ناشر : اردو پردیش اردو اکادمی

ملنے کا پتہ
صغیر نوری، محلہ دیانند نگر، بارہ بنکی

شاعری میں جمالیاتی حس کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ 'غم کی اک نئی شام سجا کر' صغیر نوری کی جمالیاتی حس کا احساس دلاتا ہے اور ان کے پورے مجموعہ میں احساس جمال کا لطف قاری کو ملے گا۔ اتنی اچھی صلاحیتوں کے باوجود انہیں غرور نہیں ہے جیسا کہ انہوں نے خود ہی کہا ہے۔

ابھی دکھاؤں تمہیں کیسے میں کمال اپنا
ابھی کمال مرا سینۂ کمال میں ہے

ابھی سے فتح کا اعلان کس طرح کر دوں
ابھی تو نوک سناں پر یہ سر سجا بھی نہیں

اشاراتی تلمیح سے لے کر سر پر غرور رکھنے سے انکار ان کو ترقی کی نئی راہوں پر گامزن کرنے کی ضمانت دیتا ہے مگر جو کچھ انہوں نے اپنی حس جمیل سے حاصل کر لیا ہے وہ ان کی سربلندی کی طرف اشارہ بھی کر رہا ہے۔

ایک احساس ہے جینے کے لئے
ورنہ کلیوں کی نزاکت کیا ہے

یہ دنیا حشر سامانیوں سے بھری ہوئی ہے اور وہ اور بھی حشر ساماں ہوگی، صغیر نوری نے غالبؔ سے استفادہ کرتے ہوئے بہت آسان لفظوں میں مندرجہ ذیل شعر نظم کر دیا ہے جو قابل تعریف ہے۔

حشر سے روز گزرتا ہوں صغیرؔ
مجھ سے پوچھو کہ قیامت کیا ہے

انقلاب زمانہ کا احساس آج کے بے بس مجمع عام میں کتنا کم ہے؟ ایسے حالات میں اس کا علاج کیا ہے؟ ابھی اس طرف توجہ نہیں گئی ہے۔

صغیر نوری یہ تو کہتے ہیں کہ:

کل تک جو تیرے در کا بھکاری تھا اے صغیرؔ
قیمت لگا رہا ہے وہ تیرے مکان کی

مگر اس درد کا علاج کیا ہے؟ اگر وہ علامہ اقبال کی طرح علاج بھی بیان کرنے لگیں تو بہت بڑے شاعر ہو جائیں گے اور مجھے نہ جانے کیوں یہ احساس ہو رہا ہے کہ وہ مستقبل کے بڑے شاعر ہو سکتے ہیں۔

صغیر نوری کا 'احساس' قارئین کتنا محسوس کرتے ہیں وہ تو ان کے مطالعہ کے بعد ظاہر ہوگا البتہ جو اشعار مجھے بہت پسند آئے ان میں کچھ نذر قارئین ہیں۔

سینۂ عرش پہ ہیں نقش قدم انسان کے
قابل فخر بتا اوج بشر ہے کہ نہیں

یہ مہر و ماہ، ستارے غلام تھے جن کے
ترس رہے ہیں وہی آج روشنی کے لئے

فقط لباس بدلنے سے کچھ نہیں ہوگا
عمل بھی چاہئے دنیا میں برتری کے لئے

حصول علم کے ہمراہ عہد حاضر میں
کوئی نہ کوئی سبھی میں ہنر ضروری ہے

❑❑❑

ہماری اردو زبان وادب نے دیگر زبانوں کے مقابلے بہت کم عرصہ میں ایک طویل مسافت طے کی ہے جو دو سے تین صدیوں کے دورانیہ سے زیادہ پر محیط و بسیط ہے۔اس کی مقبولیت اور ہر دلعزیزیت ہر عہد میں اپنے خاص نکتہ ارتکاز پر ایک دائمی استمرار کی صورت پیش رفت کرتی رہی ہے۔اس کی خاص وجہ اس کے دامن میں پائی جانے والی وسعت ہے۔یہ زبان اپنے اندر کسی طرح کے ادبی وثقافتی افتراق پر یقین نہیں رکھتی،یہی اس زبان کی وسعت پذیری کی سب سے اہم وجہ ہے۔اس زبان کے مکمل جغرافیہ حدود میں ادب کی بیشتر اصناف سخن کی ایک کلیدی اہمیت ہے۔خاص کر اردو شعریات کی وجہ سے اس کے ادبی اثاثے میں خاصی رنگینیس پیدا ہوئی ہے۔اردو ادب کی ابتدائی شاعری سے لے کر موجودہ عہد کے شاعری نے بدلتے ہوئے زمانے کے ساتھ اپنے نئے رجحان ساز راستوں کو ہموار کیا ہے،اور ہماری اردو شعریات نے بہت سی تحریکات اور نظریات کی قبائیں تراشیں اور اپنی لفظیات کے جدید تصرفات سے معنوی جہات کے نو بہ نو افق روشن کئے۔

میں یہاں پر اردو زبان وادب کی قدیم شعری روایات سے شعوری طور پر انحراف انصراف کرتے ہوئے موجودہ عہد کی جدید آمیز شاعری پر مذکورہ کتاب کے حوالے سے گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔''قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان دہلی'' سے شائع ہونے والا مونوگراف اردو زبان کے جدید شاعر''راجندر منچندا بانی'' کی مجموعی ادبی خدمات پر مشتمل ہے۔جو عمیر منظر کا ایک گرانقدر ادبی کارنامہ ہے۔اس مونوگراف میں عمیر منظر نے بانی کی سوانح حیات بھی ضبط تحریر کی ہے۔جسے پڑھنے کے بعد قاری کو بانی کی زندگی سے متعلق بہت سی دلچسپ معلومات تک رسائی یقینی ہے۔اور جہاں تک بانی کی ادبی اہمیت کی بات ہے تو ان کی تخلیقی صلاحیت خود اپنے آپ پر ایک منطقی جواز رکھتی ہے۔

عمیر منظر نے اس کتاب کی درجہ بندی مختلف عناوین کے تحت کی ہے۔اس کتاب کا پہلا عنوان''سوانح اور شخصیت'' دوسرا عنوان''بانی کی غزل گوئی سے متعلق ہے۔اس عنوان کے تحت بانی کی شعری لیاقت اور ان کے ذہنی تجدد آمیزی کی بھرپور عکاسی کی گئی ہے۔راجندر منچندا بانی کو وہ شہرت اور مقبولیت نہیں ملی وہ جس کے حقدار تھے۔لیکن بانی کی غزلیں اردو ادب کے مشہور ناقدین کی وسعت امکان سے باہر نہیں تھیں،اس لئے بزرگ نقاد نے ان کی تخلیقی صلاحیتوں کا اعتراف بڑے کشادہ دلی کے ساتھ کیا ہے۔اس کے تمام شواہد اس کتاب میں موجود ہیں۔ 1970 کے بعد جدید شعرا کی جو صف بندی کی گئی ہے اس میں راجندر منچندا بانی کا نام بھی شامل ہے،اس کا اعتراف خود گوپی چند نے اپنے ایک مضمون میں کیا ہے،اور وہ مضمون پاکستان کا معروف جریدہ''فنون'' لاہور میں شائع ہو چکا ہے۔اس کے علاوہ پروفیسر شمیم حنفی،شمس الرحمٰن فاروقی،پروفیسر عتیق اللہ وغیرہ نے بھی بانی کی غزلوں کی علامتوں پر ایک الگ زاویہ انفراد سے گفتگو کی ہے،اور خاص کر شمس الرحمٰن فاروقی نے اپنے مقبول ترین رسالے''شب خون'' میں ان کی بہت سی غزلوں کی اشاعت بھی فرمائی تھی جس کا تذکرہ عمیر منظر صاحب نے اس کے مکمل اندراج کے ساتھ رقم کیا ہے

بانی کی غزلوں کا اپنا ایک الگ طرز اسلوب ہے،اور

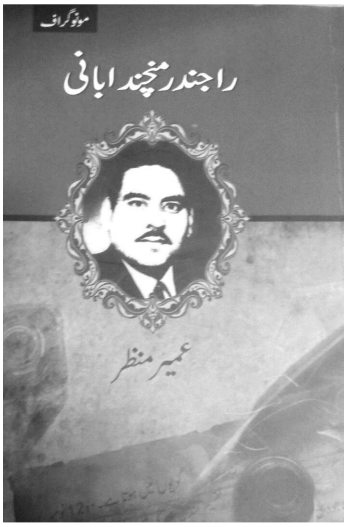

مبصر : شاہد کمال

قیمت : 76 روپئے

ناشر : قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان دہلی

ملنے کا پتہ

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان دہلی

یہ اسلوب بڑ دلچسپ ہے،جس میں لہجہ کا بانکپن اور لفظوں کا خوبصورت امتزاج ایک نیا رنگ پیدا کر رہا ہے۔اور ان غزلوں کے متون میں انسانی نفسیات اور اس سے متصادم ہونے والے متغائر احساسات اور جذبات کے مختلف کیفیات اس کے معنی کی مختلف جہات کو واشگاف کرتے ہیں۔جس سے اس کے معنوی تنوع اور ترفع ایک حیرت و استعجاب کی کیفیت کو جنم دیتے ہیں۔اور اس غزل کا ہر شعر انسان کے اجتماعی شعور کی عکاسی کرنے کے باوجود اپنے اندر ایک انفرادیت رکھتا ہے۔ان کی بیشتر غزلیں اسی جدید آہنگ سے عبارت ہیں۔لیکن ان کی غزلوں میں پائی جانے والی رومانی کیفیت میں ہیجان انگیزیت میں بڑا ،اعتدالی توازن پایا جاتا ہے۔

اس مونوگراف کا تیسرا عنوان بانی کی نظم نگاری سے متعلق ہے۔بانی نے اپنی نظموں کی تخلیق میں بڑی ماہیرانہ تکنیک کا استعمال کیا ہے،اور اپنے معنی کی ترسیل کے لئے لفظی تلازمات اور اس کے معنوی تعلیقات کا بہترین اہتمام کیا ہے،اور ان کی نظموں میں استعمال ہونے والے استعارات وتشبیہات وتلمیحات کا تصرف بڑی خوبصورتی کے ساتھ ہوا ہے۔اس مونوگراف کا تیسرا عنوان''ٹوٹتے رشتوں کا شاعر'' کے نام سے ہے۔جو پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے،یہ مضمون غالباً چار صفحات پر مشتمل ہے۔بہرحال اس عنوان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔اس کا پانچواں عنوان''بانی کی شعری انفرادیت'' سے متعلق ہے،جو اس مونوگراف کا سب سے اہم جز ہے،اس کے مطالعہ سے بانی کی شعریات کی تفہیم قدر آسان ہو جاتی ہے،اور اس کا چھٹا عنوان ''بانی کی نثر'' سے تعلق رکھتا ہے،اس عنوان میں بانی کی نثر نگاری پر روشنی ڈالی گئی ہے۔بانی جتنے اچھے شاعر تھے اسی معیار کے نثر نگار بھی تھے ان کی نثر کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں تخلیقی عناصر پائے جاتے ہیں،جب کہ ایسا بہت کم ہوتا ہے،کہ ایک اچھا شاعر بہترین نثر نگار بھی ہو،لیکن یہ سعادت بانی کو حاصل تھی اس کا ساتواں عنوان ''بانی کا نایاب کام'' سے تعلق رکھتا ہے،اس عنوان کے تحت عمیر منظر نے بانی کی کچھ غزلوں کے اشعار کا تجزیہ پیش کیا ہے،دیگر محققین کے اقتباس کے تناظر میں،اور کچھ نظموں کو بھی اس تجزیہ میں شامل کیا گیا ہے۔اس کا اٹھواں عنوان'' انتخاب کلام'' پر مشتمل ہے،جس میں بانی کی غزلوں اور نظموں پر عمیر منظر نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔اور اس کا آخری عنوان''کتابیات'' کے حوالے سے ہے،جس میں ان ماخذات کی نشاندہی کی گئی ہے جہاں سے عمیر منظر نے بانی سے متعلق استفادہ کیا ہے۔اس مونوگراف کو پڑھنے کے بعد اس بات کا انداز ہوتا ہے کہ ابھی اس میں بہت سی چیزیں تشنہ مفہوم رہ گئی ہیں۔ایسا لگتا ہے مصنف نے اس کام میں بڑی عجلت پسندی سے کام لیا ہے۔حالانکہ اس سے پرہیز کیا جانا چاہئے تھا۔لیکن اس کے باوجود یہ مونوگراف راجندر ابانی کی تخلیقی اثاثے کی رونمائی میں واجب کفائی کی حیثیت رکھتا ہے۔ □□□

آپ کے خطوط

برادرم!

السلام علیکم

شمارہ مل گیا۔ اداریہ میں تم نے ایک خاص طرح کا تجربہ کیا جو دلچسپ ہے۔ سب سے عمدہ بات یہ ہے کہ نیا دور کے آہنگ کو بھی تبدیل کیا۔ ساتھ ہی نیا رنگ دینے کی کوشش کی ہے۔ سرکاری رسائل میں بہت زیادہ آزادی نہیں ہوتی، اس کے باوجود کوئی مدیر تخیل اور تخلیقی ذہن سے کام لے کر کچھ نیا کرتا ہے تو خوشی ہوتی ہے۔ تم ٹھہرے ادب کے آدمی، اس کے لئے تم کو آسانی تھی کہ ایک ماہانہ رسالہ کو کس طرح نئی زندگی دی جاسکتی ہے۔ قسطوار ناول، ترجمے کی اشاعت کو بھی تم نے خاص بنا دیا۔

اداریہ میں اُدئے پرکاش کی جو بات تم نے کی ہے وہ کسی حد تک سچی ہے، مکمل سچ نہیں۔ تم نے مانخیز اور میلان کندیرا بھی حوالے بھی دئے۔ اُدئے کی طرح لکھنے والے ہمارے یہاں بھی ہیں۔ یہ مارخیز کے سلسلے کے ادیب ہیں لیکن ہندی میں اب یوگیندر آہوجا جیسے لوگوں کی بھی آمد ہوئی ہے جو ہندوستانی سیاست اور حالات سے علامتیں اور استعارے کشید کر رہے ہیں۔ اردو کی نئی نسل میں راجیو پرکاش ساحر، اویناش امن جیسے لوگوں کی آمد بھی خوشگوار ہے۔ غیر مسلم اردو فکشن رائٹر کی تلاش ضروری ہے۔

ابھی آج کل میں اویناش کی ایک کہانی پر میں نے اسے مبارکباد دی۔ اگلے شمارے میں آپ نے حمیراء عالیہ کا اعلان کیا ہے۔ ابھی عالیہ کی ایک کہانی افغان مسلہ پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ امکان کی فضا روشن۔ ان نئے بچوں کو خوب مطالعہ کرنا ہوگا لیکن مسرت کی بات یہ ہے کہ نئی نسل اب سامنے آنے لگی ہے۔ بہرکیف مبارکباد۔ نیا دور اب صرف اتر پردیش کا رسالہ نہیں رہا۔

مشرف عالم ذوقی

305، تاج انکلیو، گیتا کالونی، دہلی

مکرمی!

'نیا دور' کے مئی اور جون 2017 کے شمارے پیش نظر ہیں۔ میں اس ادبی اور ثقافتی جریدے کا پرانا قاری ہوں لیکن اس مرتبہ شماروں کو دیکھ کر تازگی اور جدت کا احساس ہوا۔ 'نیا دور' اب تک کمپوزنگ اور طباعت کی نئی تکنیک سے نا آشنا تھا۔ نہ جانے کیوں کمپیوٹر کے اس دور میں اسے ابھی تک کتابت کے ذریعے شائع کیا جارہا تھا۔ آپ نے اسے نئے دور سے ہم آہنگ کر کے اسم بامسمّٰی بنا دیا ہے۔ یوں تو سرکاری سطح پر ملک بھر میں کئی ادبی اور ثقافتی جریدے شائع ہوتے ہیں مگر ان میں سے بیشتر خانہ پُری کے لئے نکلتے ہیں، لیکن مرکزی حکومت کے پبلی کیشنز ڈویژن کا ماہنامہ 'آج کل' (نئی دہلی) اور اتر پردیش حکومت کے محکمہ اطلاعات ورابطہ عامہ کا جریدہ 'نیا دور' (لکھنؤ) اس لحاظ سے مختلف ہیں کہ ان میں ادب کے قارئین کے لئے کافی وشافی مواد شائع ہوتا ہے۔ ان دونوں ہی رسالوں کو بڑی دلچسپی اور لگن کے ساتھ پڑھا جاتا ہے۔ 'آج کل' کی طرح نیا دور کے قارئین بھی پورے ملک میں پھیلے ہوئے ہیں۔

'نیا دور' اب واقعی نئے دور میں داخل ہوگیا ہے۔ امید کرتا ہوں کہ آپ نہ صرف اس کا معیار برقرار رکھیں گے بلکہ اس جریدے کی چاشنی کو مزید بڑھائیں گے۔ غیر ملکی ادب اور ہندوستان کی دیگر زبانوں کی تخلیقات کے تراجم پیش کرنے کا فیصلہ لائق تحسین ہے۔ 'نیا دور' کو عالمی سطح پر مقبول بنانے کے لئے اس کا ای ایڈیشن شروع کرنے کا عزم خوب ہے۔ اس سے واقعی 'نیا دور' کو عالمی سطح پر نئے قارئین ملیں گے اور اس کا کینوس وسیع ہوگا۔ بلاشبہ 'نیا دور' کی ادارت کی ذمہ داری ایک اہم اور چیلنج بھرا کام ہے۔ مجھے امید ہے کہ آپ اس راہ سے سرخرو ہو کر گزریں گے۔

خاکسار

معصوم مرادآبادی

ایڈیٹر پندرہ روزہ 'خبردار' نئی دہلی

گرامی قدر!

سلام مسنون

بحیثیت مدیر آپ کو آپ کا منصب مبارک۔

اپنی بات میں 'تبدیلی ایک فطری عمل ہے...' پڑھ کر نہ صرف خوشی ہوئی بلکہ کافی متاثر ہوا۔ دراصل حقیقت میں یہی ہے کہ مخلوق میں اشرف المخلوق انسان اگر رب کائنات کے وجود وصفات اعلیٰ کا نہ صرف اعتراف کرے بلکہ یقین رکھے، وہ انسان آج اور بعد کی زندگی میں بھی کامیاب ہے۔

آپ کا جملہ 'ہمیں اس بات کی خوشی کم اور الجھن زیادہ ہے کہ ....' میں انکساری کی بو آتی ہے۔ دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو استقامت کے ساتھ فرض منصبی پر دیرپا قائم رکھے اور فرض شناسی کے ثبوت میں دوسروں کے حقوق اور اپنے فرائض کے انجام دینے میں تائید ونصرت فرمائے۔ آمین!

بلاشبہ زیر نظر شمارے میں بشمول تمام نگارشات کے انتخاب و طرز اشاعت میں جدت کی جھلک ہے۔ ضرورت ہے کہ نگارشات کے معیار کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس کا صحیح انتخاب اور صحیح مقام عطا کیا جائے۔ اسی کے ساتھ نیا دور کو ماہنامہ رکھتے ہوئے وقت پر اس کی اشاعت ضروری ہے۔ آج کمپیوٹر کے زمانے میں یہ کام بہت آسان ہوگیا ہے۔

آپ نے قارئین نیا دور پر اعتماد ظاہر کرتے ہوئے پذیرائی کی امید باندھی ہے۔ حسن ظن واجب ہے یوں بھی باہمی تعاون کے بغیر ایسا ممکن نہیں۔

جہاں تک میری علمی صلاحیت ومعلومات کی بات ہے تو میں اتنا کہنے کی جسارت کرسکتا ہوں کہ انسان کے اندر نفس بہت بڑا دشمن ہے۔ اگر کسی شخص کے اندر جذبہ، شعور اور اخلاص ہو تو وہ کبر نفس کے علاوہ ہر طرح کی عصبیت سے اپنے کو پاک رکھنے کی کوشش کرتا رہے گا۔ انشاء اللہ تعالیٰ نصرت وکامیابی یقینی ہے۔

امید ہے کہ میرے چند معروضات پر توجہ دینے کی زحمت فرمائیں گے جیسا کہ اس شمارے سے کی اشاعت سے امیدیں وابستہ ہیں۔

آپ کا مخلص

روشن علی صدیقی

ابوبازار، ناصر لائبریری، گورکھپور

लोकार्पण

राज्य महिला सशक्तीकरण मिशन
के अन्तर्गत